الرسالہ

سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

برداشت بزدلی نہیں ______

برداشت زندگی کا ایک اصول ہے

اپریل ۱۹۸۵ شمارہ ۱۰۱

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

اپریل ۱۹۸۵ ☐ شمارہ ۱۰۱

قیمت فی پرچہ	۳ روپیہ
زرتعاون سالانہ	۲۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دوسو روپے
بیرونی ممالک سے:	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لیے بنک سے رقم بھیجتے ہوے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی AL-RISALA MONTHLY لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ
سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شرک اور کبر

ان اللہ لا یغفر ان یُشرك به و یَغفر ما دون ذالك لمن یشاء ومن یُشرك باللہ فقد افتریٰ اثما عظیما (النساء ۴۸)

بے شک اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے۔ اور اس کے سوا جس کے لئے چاہے گا بخش دے گا۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے اس نے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا۔

عن عبد اللہ بن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یدخل الجنۃ من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من کبر۔ قیل وما الکبر قال: الکبر بطر الحق و غمط الناس (مسلم)

حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جنت میں وہ شخص نہیں جائے گا جس کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی کبر ہو۔ پوچھا گیا کہ کبر کیا ہے۔ آپ نے فرمایا؛ حق کو نظر انداز کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔ (مسلم)

اس دنیا میں سب سے زیادہ خلاف واقعہ بات یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو بڑائی کا درجہ دیا جائے۔ یہی خدا کے نزدیک سب سے بڑا جرم ہے۔ آدمی اگر اپنے آپ کو بڑا سمجھ لے تو یہ کبر ہے۔ اور اگر وہ کسی دوسرے کو بڑا قرار دے تو اسی کا نام شرک ہے۔

خدا کی معرفت خدا کے سوا دوسری تمام عظمتوں کو ڈھا دیتی ہے بشمول اپنی عظمت کے۔ خدا کے سوا دوسروں کی عظمت کا نام شرک ہے اور اپنی عظمت کا نام کبر۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لئے یہاں ہر قسم کے لوگوں کو بسنے کے مواقع ملے ہوئے ہیں۔ مگر آخرت کی دنیا آئیڈیل دنیا ہوگی۔ وہاں صرف وہی لوگ عزت کا مقام پائیں گے جنھوں نے موجودہ آزمائشی دنیا میں یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ حقیقت واقعہ کی سطح پر جینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کبر اور شرک کی سطح پر جینا غیر حقیقی سطح پر جینا ہے۔ اس لئے جو لوگ کبر اور شرک کی سطح پر زندگی گزاریں گے وہ آخرت کی ابدی دنیا میں بسنے کے لئے سراسر نا اہل ٹھہریں گے۔

جنت ان اعلیٰ انسانوں کے لئے ہے جو خدا کی بڑائی میں جیتے ہوں۔ جہنم ان پست لوگوں کا مقام ہے جو غیر خدا کی بڑائی میں جئیں، خواہ یہ جینا خود اپنی بڑائی میں ہو یا اپنے سوا کسی دوسرے کی بڑائی میں۔

کھونے والا پاتا ہے

اگر آپ بمبئی میں ہیں اور کلکتہ جانا چاہتے ہیں تو پہلے آپ کو بمبئی کو چھوڑنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی آپ کلکتہ میں موجود ہوسکتے ہیں۔ جو آدمی خدا کا طالب ہو وہ بھی گویا ایک قسم کا مسافر ہے۔ اگر وہ اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا ہے تو اس کی ایک ہی لازمی شرط ہے۔ یہ کہ وہ اپنی سابقہ جگہ کو چھوڑنے پر راضی ہو جائے۔ اس کے بعد ہی وہ اپنی مطلوب خدائی منزل پر پہنچنے کی خوشی حاصل کرسکتا ہے۔

دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں لینے کے لئے دینا پڑتا ہے۔ یہاں کھونے میں پانے کا راز چھپا ہوا ہے۔

آپ اگر ایک نفع بخش تجارت کے مالک بننا چاہتے ہیں تو پہلے اپنا اثاثہ اس میں کھپانا پڑے گا۔ اگر آپ اپنے کھیت میں ہری بھری فصل دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنے بیج کے ذخیرے کو مٹی میں ملا دینا ہوگا۔ اگر آپ منصوبہ بندی کے تحت دوررس عمل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے فوری جذبات کو کچل دینے پر اپنے آپ کو راضی کرنا پڑے گا۔ اگر آپ دولت مند بننا چاہتے ہیں تو ضروری ہوگا کہ آپ اپنے کو فضول خرچی سے باز رکھیں۔

جو ذرہ نہ پھٹے وہ کبھی ایٹمی طاقت نہیں بنتا۔ جو دانہ اپنے آپ کو فنا نہ کرے وہ درخت کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ جو فرد اپنے ذاتی مفاد کو قربان نہ کرے وہ اجتماعی مفاد کو قائم کرنے کا کریڈٹ نہیں پاتا۔

یہی معاملہ خدا کا بھی ہے۔ کوئی شخص خدا والا اس وقت بنتا ہے جب کہ وہ خدا کی خاطر اپنے کو حذف کر دے۔ جو شخص اپنے وجود کو حذف کرنے کے لئے تیار نہ ہو وہ کبھی خدا والا بھی نہیں بنتا۔

خدا کو پانے کے لئے اپنے آپ کو کھونا پڑتا ہے —— یہی ایک لفظ میں خدا کو پانے کا راز ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو بھی پانا چاہے اور خدا کو بھی، وہ صرف اپنے آپ کو پائے گا۔ ایسا آدمی کبھی خدا کو پانے والا نہیں بن سکتا۔

دعا

"میرے لئے بائیسکل خرید دیجئے" ایک غریب خاندان کے لڑکے نے اپنے باپ سے کہا۔ باپ کے لئے بائیسکل خریدنا مشکل تھا۔ اس نے ٹال دیا۔ لڑکا بار بار کہتا رہا اور باپ بار بار منع کرتا رہا۔ آخرکار ایک روز باپ نے ڈانٹ کر کہا "میں نے کہہ دیا کہ میں بائیسکل نہیں خریدوں گا۔ آئندہ مجھ سے اس قسم کی بات مت کرنا"

یہ سن کر لڑکے کی آنکھ میں آنسو آگئے۔ وہ کچھ دیر تک چپ رہا۔ اس کے بعد روتے ہوئے بولا "آپ ہی تو ہمارے باپ ہیں۔ پھر آپ سے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں" اس جملہ نے باپ کو تڑپا دیا۔ اچانک اس کا انداز بدل گیا۔ اس نے کہا "اچھا بیٹے، اطمینان رکھو۔ میں تم کو ضرور بائیسکل دوں گا" یہ کہتے ہوئے باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ اگلے دن اس نے پیسہ کا انتظام کرکے بیٹے کے لئے نئی بائیسکل خرید دی۔

لڑکے نے بظاہر ایک لفظ کہا تھا۔ مگر یہ ایسا لفظ تھا جس کی قیمت اس کی اپنی زندگی تھی۔ جس میں اس کی پوری ہستی شامل ہوگئی تھی۔ اس لفظ کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے سرپرست کے آگے بالکل خالی کر دیا ہے۔ یہ لفظ بول کر اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے نقطہ پر کھڑا کر دیا جہاں اس کی درخواست اس کے سرپرست کے لئے بھی اتنا ہی بڑا مسئلہ بن گئی جتنا وہ خود اس کے اپنے لئے تھی۔

یہ انسانی واقعہ خدائی واقعہ کی تمثیل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون سی دعا ہے جو لوٹائی نہیں جاتی۔ یہ وہ دعا ہے جس میں بندہ اپنی پوری ہستی کو انڈیل دیتا ہے۔ جب بندے کی آنکھ سے عجز کا وہ قطرہ ٹپک پڑتا ہے جس کا تحمل زمین و آسمان بھی نہ کر سکیں۔ جب بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے ساتھ اتنا زیادہ شامل کر دیتا ہے کہ "بیٹا" اور "باپ" دونوں ایک ترازو پر آجاتے ہیں۔

یہ وہ لمحہ ہے جب کہ دعا محض زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ ایک شخصیت کے پھٹنے کی آواز ہوتی ہے۔ اس وقت خدا کی رحمتیں اپنے بندے پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ بندگی اور خدائی دونوں ایک دوسرے سے راضی ہو جاتے ہیں۔ قادر مطلق عاجز مطلق کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

زلزلہ درکار ہے

خدا کی جنت جتنی نفیس ہے اتنی ہی بڑی قیمت اس کی ادا کرنی پڑتی ہے۔ جنت صرف ان حوصلہ مندوں کے لئے ہے جو بھونچال کی قیمت پر اس کو حاصل کرنے کے لئے راضی ہو جائیں۔ جنت کو پانے کے لئے آدمی کو ایسے کٹھن مرحلے سے گزرنا ہوتا ہے جس کو انسانی زبان میں صرف زلزلہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

جو آدمی آخرت کی ابدی جنت کا طالب ہو اس کو سب سے پہلے اپنی ذات کے اندر زلزلہ لانا ہے۔ جس طرح ایٹم کے مجموعہ میں بے پناہ طاقت چھپی ہوئی ہے۔ مگر یہ طاقت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب کہ ایٹم کو توڑا جائے۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ ہر آدمی کے اندر ایک عظیم ربانی انسان چھپا ہوا ہے۔ موجودہ امتحان کی دنیا میں آدمی کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک انفجار برپا کرے تاکہ اس کے اندر چھپا ہوا ربانی انسان باہر آسکے۔

ہر آدمی اصلاً فطرت خداوندی پر پیدا ہوتا ہے مگر ماحول، روایات، خواہشات اور اس طرح کے دوسرے اسباب اس کے اوپر تہہ بہ تہہ پردے ڈال دیتے ہیں۔ آدمی ایک مصنوعی غلاف میں بند ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس کے تحت وہ سوچتا ہے اور جس کے مطابق وہ جیتا ہے۔ اسی مصنوعی پردہ کو پھاڑنے میں انسان کی تمام ترقیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔ اپنے ذہنی سانچہ کو توڑنا بلاشبہ اس دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ مگر اسی مشکل ترین کام میں خدا نے تمام انسانی سعادتوں کا راز چھپا دیا ہے۔

قرآن کے الفاظ میں انسان جب اپنے شاکلہ کو توڑتا ہے تو اس کا شاکلہ خدا کے شاکلہ کے ہم سطح ہو جاتا ہے۔ اس کی ربانی فطرت جاگ اٹھتی ہے۔ وہ براہ راست خدائی فیضان کی زد میں آجاتا ہے۔ وہ محدودیت کی دنیا سے نکل کر ابدیت کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کی سوچ خدائی سوچ بن جاتی ہے۔ اس کا اخلاق خدائی اخلاق کے ہم رنگ ہو جاتا ہے۔ بیج کے اندر ایک شاداب درخت چھپا ہوا ہے۔ مگر یہ درخت اسی وقت ظہور میں آتا ہے جب کہ بیج ٹوٹے اور اپنے کو فنا کرنے کے لئے تیار ہو۔ اسی طرح ہر آدمی کے اندر ایک ربانی انسان چھپا ہوا ہے جو جنت کی حسین دنیا کا باسی بن سکے۔ مگر اس چھپے ہوئے انسان کا وقوع میں آنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ انسان اپنے اندر ایک زلزلہ پیدا کرنے کے لئے تیار ہو۔ وہ مصلحتیں اور محبوبات جن کو بچانے کے لئے آدمی اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے انھیں مصلحتوں اور محبوبات کا ٹوٹنا جنت کے دروازہ کا کھلنا ہے۔ مگر اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے۔

نفی ذات

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو قرآن میں احسن القصص (بہترین قصہ) کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی زندگی اس بات کی ایک تاریخی مثال ہے کہ کس طرح خدائی مدد واقعات کے دھارے کو پھیر دیتی ہے۔ وہ ایک اسوء القصص کو احسن القصص بنا دیتی ہے۔

حضرت یوسف کے دشمنوں نے آپ کو کنویں میں ڈال دیا۔ مگر خدا نے آپ کو کنویں سے نکال کر مصر کے تخت پر پہنچا دیا۔ جہاں آپ کے مخالفین نے آپ کی کہانی ختم کرنی چاہی تھی وہیں سے آپ کی ایک نئی شاندار تر کہانی شروع ہو گئی۔

سورہ یوسف میں آنجناب کا قصہ بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے: یہاں تک کہ جب پیغمبر مایوس ہو گئے اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا تو ان کو ہماری مدد آپہنچی۔ پھر ہم نے جس کو چاہا بچا لیا اور ہمارا عذاب مجرموں سے ٹالا نہیں جاتا۔

(یوسف ۔ ۱۱۰)

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی مدد مایوسی کی حد پر پہنچ کر ملتی ہے" مایوسی "سے مراد وہ مقام ہے جہاں بندہ اپنا سب کچھ دے کر خالی ہو چکا ہو۔ اس کے پاس مزید کچھ دینے کے لئے باقی نہ رہے۔ جب وہ محسوس کرنے لگے کہ بندگی کی حد ختم ہو گئی۔ اب وہ درجہ آگیا ہے جہاں سے خدائی کی حد شروع ہوتی ہے۔ عین اس وقت خدا کی مدد آجاتی ہے۔ ناکامی کی انتہا کامیابی کا آغاز بن جاتا ہے۔

بیج کا ختم ہونا ایک درخت کو وجود دینا ہے۔ یہی معاملہ خدا اور بندے کا بھی ہے۔ آدمی خدا کی مدد کا مستحق اس وقت بنتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے لئے مٹا دے۔ جہاں اعتماد خویش ختم ہو جائے وہاں سے اعتماد علی اللہ کا آغاز ہوتا ہے۔

خدا بلا شبہ سب سے بڑی طاقت ہے۔ مگر خدا کو پانا ہمیشہ اپنی نفی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ آدمی اپنی نفی نہیں کر پاتا اسی لئے وہ خدا کو پانے والا بھی نہیں بنتا۔ خدا ہر چیز کا بدل ہے۔ خدا کو پانا سب کچھ کو پا لینا ہے۔ مگر انسان کی یہ نادانی بھی عجیب ہے کہ وہ بے کچھ کے لئے سب کچھ کو کھو دیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں خدا سے محروم ہو جاتا ہے۔

امتحان

حضرت ابراہیم کو خواب میں دکھایا گیا کہ آپ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم خواب کے مطابق بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر جیسے ہی آپ نے بیٹے کے گلے پر چھری رکھی، آواز آئی کہ بس۔ تم نے خواب کو پورا کر دکھایا۔ اس کے بعد آپ کو خصوصی طور پر ایک مینڈھا فراہم کیا گیا اور آپ نے بیٹے کے بدلے اسی مینڈھے کو ذبح کیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ـــــ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قربانی مانگی جاتی ہے مگر قربانی لی نہیں جاتی گلے پر چھری رکھی جاتی ہے مگر قبل اس کے کہ چھری آدمی کا گلا کاٹے، چھری کو گلے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

اس دنیا میں آدمی کا اصل امتحان نفسیاتی امتحان ہے نہ کہ جسمانی امتحان۔ خدا انسان کی آمادگی کو دیکھتا ہے نہ کہ کر ڈالنے کو۔ خدا کبھی کسی کو غیر ضروری مشقت میں نہیں ڈالتا۔ مگر مشقت سے نجات اسی کو ملتی ہے جو اپنے آپ کو مشقت کے حوالے کرنے کا واقعی ثبوت دے دے۔

جو لوگ قربانی کے راستہ سے بھاگتے ہیں وہ صرف اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ خدائے رحمان و رحیم پر یقین نہیں رکھتے۔ خدا تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ وہ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ شفیق ہے جتنا کوئی باپ اپنے عزیز بیٹے کے لئے شفیق ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں قربانی کے راستہ سے بھاگنا خدا کے خلاف بے اعتمادی کا اظہار ہے۔ حالاں کہ خدا جتنا لیتا ہے اس سے بہت زیادہ دیتا ہے۔ حضرت ابراہیم نے خدا کو صرف ایک بیٹا پیش کیا تھا۔ اور خدا نے ان کو سارے عالم کی امامت دیدی۔

انسان کو چاہئے کہ وہ کسی تحفظ کے بغیر خدا کے راستہ پر چل پڑے۔ وہ قربانی کے مواقع پر ہرگز اپنی طرف سے کوئی کمی نہ کرے۔ اسی کے ساتھ وہ یقین رکھے کہ شفیق باپ سے بھی زیادہ مہربان اور طاقتور خدا ہر آن اس کو دیکھ رہا ہے۔ خدا آدمی کا امتحان ضرور لیتا ہے مگر قبل اس کے کہ آدمی ہلاکت میں پڑے وہ ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیتا ہے۔

کیسا عجیب ہے وہ بیٹا جو باپ کی پکار پر یقین نہ کرے۔ کیسا عجیب ہے وہ بندہ جو خدا کے بارہ میں اپنا اعتماد کھو دے۔

خدا کا عقیدہ

میں نئی دہلی میں گیٹ آف انڈیا کے سامنے کھڑا تھا۔ گیٹ آف انڈیا تعمیر اور سنگ تراشی کا بے حد حسین نمونہ ہے۔ وہ مشاہدہ کی زبان میں بتا رہا ہے کہ انسان کیسی انوکھی صلاحیتوں کا مالک ہے وہ "گیٹ آف انڈیا" جیسی ایک چیز کو پیشگی طور پر سوچتا ہے۔ وہ اس کا منصوبہ بناتا ہے اور پھر عملاً اس کو وقوع میں لاتا ہے۔

اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اگر تمام ستاروں اور سیاروں اور تمام درختوں اور جانوروں سے کہا جائے کہ وہ ایک "گیٹ آف انڈیا" بنا دیں تو سب مل کر بھی اس کے جیسی ایک عمارت نہیں بنا سکتے۔

یہی دوسرے تمام انسانی واقعات کا حال ہے۔ انسان جو کام کرتا ہے وہ اس کی انتہائی نادر استثنائی خصوصیت ہے۔ معلوم کائنات میں کوئی بھی دوسری مخلوق اس قسم کے کام کو انجام نہیں دے سکتی جس کو انسان اپنی عقل اور اپنے ہاتھ پاؤں کو استعمال کر کے انجام دیتا ہے۔ خواہ وہ ایک گیٹ آف انڈیا کو بنانا ہو یا ایک پیچیدہ مشین کو چلانا۔

انسان سے خدا کو یہ مطلوب تھا کہ وہ خدا کی شعوری معرفت حاصل کرے۔ وہ اپنی عقل سے خدا کو پہچانے۔ اس لئے اس نے انسان کو ایسی ممتاز تخلیق کے ساتھ پیدا کیا۔ جس طرح انسان ساری کائنات سے ممتاز ایک ہستی ہے، اسی طرح خدا انسان کے مقابلہ میں ایک ممتاز تر ہستی ہے۔ انسان اگر اس فرق پر غور کرے جو اس کے اور بقیہ کائنات کے درمیان ہے تو اسی پر وہ اس فرق کو قیاس کر سکتا ہے جو اس کے اور خدا کے درمیان ہے۔ خدا اسی امتیازی فاصلہ کی آخری اور انتہائی شکل ہے جس کا آدمی اپنے اور کائنات کے درمیان فاصلہ کے ذریعہ تجربہ کر رہا ہے۔ خدا کو سمجھنا اتنا ہی آسان ہے جتنا اپنے آپ کو سمجھنا۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننا ایک مانی ہوئی چیز کو ماننا ہے۔ خدا کو دیکھنا ایک دیکھی ہوئی چیز کو دیکھنا ہے۔ انسان جس واقعہ کا ہر آن تجربہ کر رہا ہے۔ اسی واقعہ کی توسیع کا دوسرا نام خدا کا عقیدہ ہے۔ انسان اس کائنات میں "فل اسٹاپ" نہیں۔ پھر اگر کائنات کے آگے انسان کا درجہ ممکن ہے تو انسان کے آگے خدا کا درجہ کیوں ممکن نہیں۔

خدا سے غافل

کسی شخص سے اس کے عزیز بیٹے کا ذکر کیجئے تو اس کے پاس اپنے بیٹے کے بارہ میں کہنے کے لئے اتنی زیادہ باتیں ہوں گی جو کبھی ختم نہ ہوں۔ مگر اسی شخص کے سامنے خدا کا تذکرہ کیجئے تو وہ اس طرح غیر متحرک بنا رہے گا جیسے کہ اس کے پاس خدا کے بارہ میں کہنے کے لئے کوئی بات ہی نہیں۔ جیسے کہ وہ خدا کے بارہ میں کچھ جانتا ہی نہیں۔

کسی شخص کو اس کے خاندانی بزرگ کی یاد دلایئے تو وہ اس قدر پر جوش طور پر بولنے لگے گا جیسے کہ اس کے تمام اندرونی احساسات جاگ اٹھے ہوں۔ مگر اسی شخص کے سامنے خدا کا ذکر کیجئے تو وہ جذبات سے اس طرح خالی نظر آئے گا جیسے کہ اس کو معلوم ہی نہیں کہ خدا کے بارہ میں کیا کہا جائے۔

کسی شخص کے سامنے اس کے جماعتی اکابر کا نام لے لیجئے۔ اچانک الفاظ کا دریا اس کی زبان سے بہہ پڑے گا۔ وہ اس وقت تک چپ نہ ہوگا جب تک آپ مداخلت کر کے موضوع کو بدل نہ دیں۔ مگر اسی شخص کے سامنے خدا کا نام لیجئے تو اس کے اندر کوئی جوش پیدا نہ ہوگا۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے اس کے پاس خدا کے بارہ میں بولنے کے لئے کوئی چیز ہی نہیں۔

ایک شخص کے سامنے اس کے قومی ہیرو کا چرچا کر دیجئے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ اچانک وہ بادشاہ سخن بن کر ظاہر ہو گیا ہے۔ مگر اسی کے سامنے خدا کا چرچا کیجئے تو وہ ایسا نظر آئے گا جیسے کہ اس کے اندر خدا کا نام سن کر کوئی ہلچل ہی پیدا نہیں ہوئی جو اس کو بولنے پر مجبور کر دے۔

آہ وہ لوگ جن کے پاس رجال کی تعریف کے لئے الفاظ ہوں مگر خدا کی تعریف کے لئے ان کے پاس الفاظ نہ ہوں۔ انسانوں کے بارہ میں وہ معلومات کا خزانہ بنے ہوئے ہوں مگر خدا کے بارہ میں ان کے پاس کوئی معلومات نہیں جو ان کی زبان یا قلم جاری ہو۔ کیا سینوں میں ایمان کے سوتے خشک ہو گئے۔

کیا لوگوں نے خدا کی عظمت کو محسوس نہیں کیا جس کو وہ لوگوں سے بیان کریں۔ کیا لوگوں کو خدا کے کمالات کا کوئی مشاہدہ نہیں ہوا۔ کیا انھیں صرف مخلوقات کی خبر ہے، خداوند ذوالجلال کی انھیں کوئی خبر نہیں۔

سب چلے گئے

فیبین سوشلزم (Fabian Socialism) ایک سوسال پہلے انگلینڈ میں وجود میں آئی۔ برنارڈ شا اور دوسرے بہت سے دانشور اس سے وابستہ تھے۔ فیبین کا لفظ ایک رومی جنرل (Fabius Maximus) کے نام سے لیا گیا تھا۔ یہ لوگ غریبی اور جہالت کے خاتمہ پر زور دیتے تھے اور جبر کے بغیر سوشلزم لانے کے علمبردار تھے۔ یہ گروہ فیبین سوسائٹی (Fabian Society) کے نام سے مشہور ہوا۔

اس نظریہ کو ماننے والوں میں ایک خاتون بیٹرس ویب (Beatrice Webb) بھی تھیں۔ وہ اپنی ڈائری لکھتی رہتی تھیں جو ان کے بعد شائع ہو کر کافی مقبول ہوئی۔ اس ڈائری کے آخری اندراجات میں سے ایک وہ ہے جو انھوں نے ۱۹۴۳ کی کسی تاریخ کو لکھا تھا۔ اس میں مذکورہ خاتون نے تحریر کیا تھا:

> Everything and everyone is disappearing — Churchill, Roosevelt, Stalin. What an amazing happening, and well worth recording in my diary. But that also will suddenly disappear (1943).

ہر چیز اور ہر شخص غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ چرچل، روزولٹ، اسٹالن، سب چلے گئے۔ کیسے عجیب ہیں یہ واقعات، اور کس قدر زیادہ میری ڈائری میں لکھے جانے کے قابل، مگر وہ بھی اچانک ایک روز غائب ہو جائے گی۔ (ہندستان ٹائمس ۲۵ دسمبر ۱۹۸۴)

کیسے کیسے انسان اس دنیا میں آتے ہیں۔ وہ کیسے کیسے کمالات دکھاتے ہیں۔ اور پھر اچانک ایک روز اس دنیا سے چلے جاتے ہیں، جیسے کہ ان کا یہاں آنا اور یہاں سے جانا ان کی اپنی مرضی سے نہ ہو۔ بلکہ کوئی اور ہو جو ان کو یہاں لاتا ہو اور پھر اپنے یک طرفہ فیصلہ کے تحت انھیں یہاں سے اٹھا لے جاتا ہو۔

اس واقعہ کی کوئی بھی بامعنی توجیہہ اس کے سوا نہیں ہے کہ پیغمبروں کی اطلاع کے مطابق آخرت کو مانا جائے۔ آخرت کو شامل کرنے کے بعد موجودہ دنیا کی ہر چیز بامعنی ہو جاتی ہے اور آخرت کو شامل کئے بغیر موجودہ دنیا کی ہر چیز بے معنی۔

امتحان

انسان کی آنکھ کیسی عجیب چیز ہے۔ اگر آپ اپنی آنکھ بند کرلیں تو آپ کو کچھ دکھائی نہیں دے گا۔ ساری دنیا آپ کے لئے ایک نامعلوم اندھیرا بن کر رہ جائے گی۔ دنیا ہوگی مگر آپ اس کو نہیں دیکھیں گے۔ چیزیں ہوں گی مگر آپ ان کو محسوس نہیں کریں گے۔

مگر جب آپ اپنی آنکھ کھولتے ہیں تو حیرت انگیز طور پر آپ تمام چیزوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔ اب کالی چیز آپ کو سفید چیز سے الگ دکھائی دینے لگتی ہے۔ اب متحرک چیز آپ کو متحرک دکھائی دیتی ہے اور جامد چیز جامد حالت میں نظر آتی ہے۔ آپ انسان کو انسان کے روپ میں دیکھتے ہیں اور جانور کو جانور کے روپ میں۔

یہی انسان کا خصوصی امتیاز ہے۔ وہ چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے پہچانتا ہے۔ وہ خیر اور شر کا فرق کرنا جانتا ہے۔ وہ روشنی کو تاریکی سے اور تاریکی کو روشنی سے جدا کرکے دیکھتا ہے۔ وہ یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ حق کو حق کے روپ میں دیکھے اور باطل کو باطل کے روپ میں پہچان لے۔ وہ اس فرق سے آشنا ہے کہ کون سی چیز دلیل سے ثابت ہوئی اور کون سی چیز دلیل سے ثابت نہیں ہوئی۔

انسان کی یہی خصوصیت اس کے لئے اس کے امتحان کا پرچہ ہے۔ یہی وہ خاص مقام ہے جہاں اس کا خدا اس کا امتحان لے رہا ہے۔ انسان کو اس دنیا میں یہ ثبوت دینا ہے کہ اس نے خیر کو شر سے الگ کرکے دیکھا۔ اس نے ظلم اور انصاف کے فرق کو پہچانا۔ اس کے سامنے جب کوئی بات آئی تو اس نے اس کو دلیل کی سطح پر جانچا۔ اگر وہ بے دلیل تھی تو اس نے اسے رد کردیا اور اگر وہ دلیل سے ثابت ہورہی تھی تو اس نے کھلے طور پر اس کا اعتراف کرلیا۔

یہ امتحان بظاہر بہت آسان ہے مگر اس کی ایک قیمت دینی پڑتی ہے۔ یہ قیمت اپنی نفی ہے۔ حق کسی آدمی کو اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر ملتا ہے۔ آدمی یہ قیمت نہیں دے پاتا، اس لئے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ امتحان میں ناکام ہوجاتا ہے۔

آدمی کے سامنے حق ظاہر ہوتا ہے مگر وہ اس کو دیکھ نہیں پاتا۔ اس کے پاس حق کی آواز گونجتی ہے مگر وہ اس کو سن نہیں پاتا۔ حق خود چل کر اس کے پاس آتا ہے مگر اس سے اس کی ملاقات نہیں ہوتی۔ آہ، وہ انسان جو عین اس مقام پر سب سے زیادہ ناکام ہوجاتا ہے جہاں اس کو سب سے زیادہ کامیاب ہونا چاہئے۔

کامیاب زندگی

اسٹوراٹ کیلی (Stuart Kelly) اونٹاریو کا ایک ٹرک ڈرائیور تھا۔ اس نے لاٹری کا ایک ٹکٹ خرید ا۔ جنوری ۱۹۸۴ میں اس کے نتیجہ کا اعلان ہوا تو اس کو پہلا انعام ملا جو ۹ء۱۳ ملین ڈالر تھا۔ یہ کناڈا میں ملنے والے اب تک کے تمام لاٹری انعامات میں سب سے زیادہ تھا۔

اسٹوارٹ کیلی کے یہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کو اتنا بڑا انعام ملا تو اس نے کہا کہ یہ میری تمام ممکن ضرورتوں سے بھی زیادہ ہے۔ مگر اس کی خوشیوں کا ابھی آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے غم میں مبتلا ہوگیا۔ انعام ملنے کے صرف تین ماہ بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کو کینسر ہوچکا ہے۔ لاٹری انعام ملنے کے چھ ماہ بعد وہ مرگیا۔ اس کی عمر ۷۵ سال تھی۔ وہ ۳۵ سال تک ٹرک ڈرائیور رہا اور انعام ملنے کے صرف چھ ماہ بعد وہ اس دنیا سے چلا گیا۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی دولت چاہتا ہے تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے لئے ایک کامیاب زندگی کی تعمیر کرے۔ مگر موجودہ دنیا میں انسان کا اصل مسئلہ دولت نہیں بلکہ اس کا اصل مسئلہ محدودیت ہے کوئی انسان خواہ کتنی ہی زیادہ دولت اپنے لئے حاصل کرلے وہ محدودیت سے خالی نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے کوئی شخص اس دنیا میں اپنی دل پسند زندگی بھی نہیں بنا سکتا۔

دولت کی کوئی مقدار آدمی کو اس سے نہیں بچا سکتی کہ وہ بیمار نہ ہو۔ اس کو حادثہ نہ پیش آئے۔ ایک مختصر مدت کے بعد وہ مر نہ جائے۔ اور جب بیماری اور حادثہ اور موت پر انسان کو قدرت نہیں تو اپنے لئے پسندیدہ زندگی بنانے پر وہ کیسے قادر ہوسکتا ہے۔

دولت زندگی نہیں ہے۔ دولت زندگی کا ایک وسیلہ ہے۔ وسیلہ کی اہمیت ہمیشہ دوسرے درجہ کی ہوتی ہے۔ زندگی ہے تو وسیلہ کی بھی اہمیت ہے۔ اور اگر زندگی نہیں تو وسیلہ کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ مگر اکثر انسان اس فرق کو بھول جاتے ہیں۔ وہ دنیا کی دولت حاصل کرنے میں اتنا مشغول ہوتے ہیں جیسے کہ دنیا کی دولت بذات خود مقصود ہو، جیسے کہ دنیا کی دولت ہی کا دوسرا نام زندگی ہو۔

انسان کے لئے کامیاب زندگی کا کوئی نقشہ آخرت کو شامل کئے بغیر نہیں بن سکتا۔ انسان کو دو میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہے۔ موجودہ دنیا کو سب کچھ سمجھ کرنا کامی کی موت مرنا یا موجودہ زندگی کو آخرت تک وسیع کرکے اپنے لئے کامیاب زندگی کا راز دریافت کرنا۔

کتنا سنگین

اخبار ایک اعتبار سے موت کا خبر نامہ ہے۔ ہر روز اخبا
ہوتی ہیں۔ مثلاً میرے سامنے ۲۴ فروری ۱۹۸۵ کا اخبار ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ چکردھرپور ناگپور کی دو بوگیوں میں آگ لگ گئی۔ یہ آدھی رات کا وقت تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ آگ تیزی سے پھیلی۔ مگر بریک کام نہ کرنے کی وجہ سے مسافر ٹرین کو فوراً ٹھہرا نہ سکے۔ اگلے اسٹیشن پر ٹرین رکی تو بھرے ہوئے ڈبہ کے تقریباً ایک سو آدمی جل کر مر چکے تھے۔

دوسری خبروں میں صرف دہلی کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ ہندی ادیب چندرگپت ودیالنکر ۸۷ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اجیت سنگھ (۴۱ سال) جیپ میں سفر کرتے ہوئے ایکسیڈنٹ کا شکار ہوا اور مر گیا۔ ۲۵ سال کے ایک آدمی کی لاش بورے میں بند پائی گئی۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح کے واقعات ہر روز اور ہر جگہ پیش آتے ہیں۔ وہ سادہ معنوں میں صرف موت کے واقعات نہیں ہیں۔ یہ مخلوق کی اپنے خالق و مالک کے سامنے حاضری ہے۔ یہ ایک انسان کا خدا کی عدالت میں پہنچایا جانا ہے۔ یہ امتحان کے مرحلہ کو پورا کر کے ابدی انجام کے مرحلہ میں داخل ہونا ہے۔

موت کا یہ پہلو کتنا ہولناک ہے۔ یہ موت کے واقعہ کو انتہائی سنگین بنا دیتا ہے۔ اتنا سنگین کہ اس سے زیادہ سنگین کوئی دوسرا واقعہ نہیں۔

موت کے اس پہلو کا تقاضا ہے کہ آدمی سب سے زیادہ موت کے بارہ میں سوچے۔ لکھنے اور بولنے والے سب سے زیادہ اس کے بارہ میں لکھیں اور بولیں۔ انفرادی مجلسوں اور عوامی اجتماعات میں سب سے زیادہ اس کا چرچا ہو۔ مگر عملاً صورت حال اس کے برعکس ہے۔ موت ہر آدمی کو صرف یہ بتاتی ہے کہ "فلاں شخص اس دنیا سے چلا گیا"۔ وہ کسی کو یہ نہیں بتاتی کہ "میں بھی اس دنیا سے جانے والا ہوں"۔ ہر آدمی موت کے سفر کو دوسروں کا سفر سمجھتا ہے۔ کسی کو موت کے واقعہ میں اپنا سفر دکھائی نہیں دیتا۔

آہ وہ انسان، جو اس وقت تک ہوش میں آنے کے لئے تیار نہیں جب تک اس کو ہوش میں آنے کے لئے مجبور نہ کر دیا گیا ہو۔

جاننے کے بعد

پروفیسر مجیب (۱۹۸۵ - ۱۹۰۲) ہندستان کے چوٹی کے دانشوروں میں سے تھے۔ ان کی تعلیم خالص مغربی طرز کے اداروں میں ہوئی۔ انھیں شکسپیر کے ڈراموں کے بڑے بڑے حصے زبانی یاد تھے۔ ہندستان میں تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ بیرونی ملکوں میں مزید تعلیم کے لئے گئے۔ وہ ایک خوش فکر آدمی تھے۔ وہ اپنے کسی ساتھی کو رنجیدہ دیکھتے تو کہتے کہ بھئی مسکرائیے اور دور تک دیکھئے۔ وہ اردو انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی زبانیں یکساں طور پر جانتے تھے۔

دسمبر ۱۹۷۲ میں پروفیسر مجیب بیمار ہوئے۔ ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق ان کے دماغ کا آپریشن ہوا۔ آپریشن کامیاب ہوا مگر اس کے بعد ان کا حافظہ جاتا رہا۔ پروفیسر مجیب پانچ زبانوں کے ماہر تھے مگر آپریشن کے بعد وہ تمام زبانیں بھول گئے۔ حتی کہ اردو سمیت تمام زبانوں کے حروف تہجی تک انھیں یاد نہ رہے (جامعہ دسمبر ۱۹۸۴)

دس سال سے زیادہ عرصہ تک وہ اسی حال میں اپنے اوکھلا (دہلی) کے مکان میں پڑے رہے۔ یہاں تک کہ ۲۰ جنوری ۱۹۸۵ کو ان کا انتقال ہوگیا جب کہ ان کی عمر ۸۲ سال ہو چکی تھی۔ وہ ۱۹۴۸ سے ۱۹۷۳ تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر رہے۔

قرآن میں انسان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اللہ نے تم کو پیدا کیا۔ پھر وہ تم کو موت دیتا ہے۔ اور تم میں سے بعض وہ ہیں جو ناکارہ عمر تک پہنچ جاتے ہیں کہ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانیں۔ بے شک اللہ علیم و قدیر ہے (النحل ۷۰)

جوانی کے بعد بڑھاپا آنے کا واقعہ آدمی کے لئے ایک یاددہانی ہے۔ وہ اس لئے ہوتا ہے کہ آدمی اپنی اصل حقیقت کو جانے۔ وہ جانے کہ اس کا علم ذاتی نہیں ہے۔ بلکہ وہ دوسروں کا دیا ہوا ہے۔ وہ جب چاہے دے اور جب چاہے چھین لے۔ آدمی کی قوت اگر اس کی ذاتی ہو تو وہ کبھی اس سے نہ چھنے مگر قوت کا ملنا اور پھر اس کا چھن جانا اس بات کی علامت ہے کہ انسان دئے سے پاتا ہے۔ دینے والا اگر نہ دے تو وہ خود سے نہیں پا سکتا۔

یہ واقعہ ہر روز پیش آتا ہے۔ مگر نہ "بوڑھے" اس سے نصیحت لیتے جن پر یہ واقعہ گزرتا ہے اور نہ "جوان" اس سے سبق حاصل کرتے جو اس کو اپنے سامنے ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔

آخرت کے بغیر

ارنسٹ ہیمنگ وے (Ernest Hemingway) ایک امریکی فوجی تھا۔ وہ ۱۹۶۱ میں انتقال کر گیا۔ وہ ۱۹۱۸ میں اٹلی کی جنگ میں شریک تھا۔ اس نے اپنی فوجی زندگی کے درمیان جو خطوط لکھے تھے وہ کتابی صورت میں شائع کر دئے گئے ہیں۔

اٹلی کی جنگ میں جب وہ زخمی ہو گیا تو اس نے اسپتال سے اپنے گھر والوں کے نام کچھ خطوط لکھے۔ ان میں سے ایک خط میں حسب ذیل الفاظ درج تھے:

> There are no heroes in this war. All the heroes are dead. And the real heroes are the parents. They suffer a thousand times more. And how much better to die in all the happy period of undisillusioned youth, to go out in a blaze of light, than to have your body worn out and illusions shattered.

اس جنگ میں کوئی ہیرو نہیں۔ تمام ہیرو مر چکے ہیں۔ اور اصل ہیرو ان کے والدین ہیں (فوجی جوان) ایک ہزار گنا زیادہ مصیبت اٹھاتے ہیں۔ اور یہ کتنا اچھا ہے کہ جوانی کے پر کیف زمانہ میں آدمی کی موت آجائے۔ روشن شعلہ میں داخل ہونا۔ اس سے بہتر ہے کہ تمہارا جسم بوڑھا اور فرسودہ ہو جائے اور سارے فریب منتشر ہو چکے ہوں (لائف جون ۱۹۸۱)

ان الفاظ کے پیچھے زندگی کا کتنا مایوس تصور چھپا ہوا ہے۔ ایک شخص دیکھتا ہے کہ جو آدمی اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے اس کا آخری انجام یہ ہے کہ سو سال یا اس سے کم مدت میں وہ بوڑھا اور ناکارہ ہو کر مر جاتے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر زندگی بالآخر اسی کا نام ہے تو اس سے بہتر ہے کہ جوانی کے امید بھرے دور میں آدمی ہیروانہ اقدام کر کے اپنا خاتمہ کر لے۔

زندگی کو آخرت کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو بوڑھا ہو کر مرنا بھی بامعنی ہو جاتا ہے اور روشن شعلہ میں داخل ہونا بھی۔ مگر جب ایک شخص زندگی کو آخرت سے الگ کر کے دیکھتا ہے تو اس کو اپنے چاروں طرف مایوسی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر آخرت کے تصور کو شامل نہ کیا جائے تو موجودہ زندگی اپنی تمام معنویت کھو دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ اتنی ناقابل فہم ہو جاتی ہے کہ اس دنیا میں زندہ رہنا بھی آدمی کو بے معنی نظر آنے لگے۔

غلط استعمال

جون ۱۹۸۴ میں امرت سر کے سورن مندر کے خلاف فوجی کارروائی کی گئی۔ ہندستانی فوج کی اس کارروائی کا خفیہ نام آپریشن بلیو اسٹار (Operation Blue Star) تھا۔ سورن مندر سکھوں کا انتہائی متبرک مقام ہے۔ اس واقعہ کے بعد کچھ پرجوش سکھوں میں "شہید" ہونے کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ چنانچہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کو خود انھیں سکھ جوانوں نے گولی مار کر اندرا گاندھی کو قتل کر دیا جو حفاظت کی خاطر وزیر اعظم کی سرکاری رہائش گاہ میں متعین کئے گئے تھے۔

اس کے بعد مقدمہ چلا۔ ۱۱ فروری ۱۹۸۵ کو چیف میٹرو پولیٹن مجسٹریٹ مسٹر ایس ایل کھنا کی عدالت میں ملزمین کے خلاف ۲۰ صفحات کی چارج شیٹ پیش کی گئی۔ اس سلسلہ میں اخبارات میں جو رپورٹ آئی ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے:

> Satwant Singh has further been charged under section 27 of the Arms Act for using a weapon lawfully supplied to him to commit murder.

قاتل ستونت سنگھ پر اسلحہ ایکٹ کی دفعہ ۲۷ کے تحت مزید یہ الزام ہے کہ ایک ہتھیار جو اس کو جائز طور پر دیا گیا تھا اس کو اس نے قتل کرنے کے لئے استعمال کیا (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ فروری ۱۹۸۵)

ستونت سنگھ کو جو قیمتی آٹو میٹک ہتھیار دیا گیا تھا وہ وزیر اعظم کی حفاظت کے لئے تھا نہ کہ وزیر اعظم کو قتل کرنے کے لئے۔ یہ اگرچہ اس کے لئے جائز قانونی ہتھیار تھا مگر جب اس نے اس کا غلط استعمال کیا تو وہ قانون کی نظر میں مجرم قرار پایا۔ وہی ہتھیار جس کا صحیح استعمال اس کو انعام کا مستحق بناتا اس کے غلط استعمال نے اس کو سزا کا مستحق بنا دیا۔

اسی طرح خدا کی طرف سے جو چیزیں انسان کو دی گئی ہیں وہ اس کا جائز حق ہیں۔ مگر وہ صرف صحیح استعمال کے لئے ہیں۔ آدمی اگر ان چیزوں کو غلط راہ میں استعمال کرے تو وہ خدا کی نظر میں مجرم قرار پائے گا اور آخرت کی عدالت میں وہ ایسی سخت سزا کا مستحق ہوگا جس سے وہ کبھی نجات نہ پا سکے۔

اعتراف

اردو زبان کے ایک استاد کلاس میں غزل پڑھا رہے تھے۔ اس درمیان میں ایک مصرعہ آیا جو کتاب میں اس طرح چھپا ہوا تھا:

پنجۂ سل سے کھلیں گے عقدۂ گیسوئے دوست

استاد نے اس مصرعہ کی تشریح ان الفاظ میں کی ـــــ پنجۂ سل کا مطلب ہے سل کا پنجہ۔ کھلیں گے، یعنی وا ہو جائیں گے۔ عقدہ یعنی گرہ۔ گیسوئے دوست، یعنی محبوب کے گیسو۔ مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کے گیسو پنجۂ سل سے کھل جائیں گے۔

طلبہ حیرانی میں تھے۔ کیوں کہ استاد کی مذکورہ تشریح کے باوجود مصرعہ کا مطلب واضح نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے نظم کے الفاظ کو نثر میں دہرا دیا تھا۔ اتنے میں کلاس کا ایک ذہین طالب علم اٹھا۔ اس نے کہا:

"سر، میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں"

"کہو"

"سر، یہ شاید طباعت کی غلطی ہے۔ میرے خیال سے یہ پنجہ سل نہیں بلکہ پنجہ شل ہے۔ اور شل کے معنی ہیں بے جان۔ کنگھا انسانی پنجہ کے مشابہ ہوتا ہے۔ بے جان ہونے کی وجہ سے شاعر نے اس کو پنجۂ شل کہا۔ شاعر افسوس کر رہا ہے کہ ہماری جاندار انگلیاں تو محبوب کی زلف کو سنوار نہ سکیں۔ اور کنگھا جس کی انگلیاں بے جان ہیں اور وہ گویا پنجۂ شل ہے، اس کی خوش بختی دیکھو کہ اس نے زلف محبوب کے بل کھول کر اس کو سنوار دیا"

طالب علم کی اس وضاحت کے بعد کلاس کے تمام طلبہ خوش ہوگئے۔ ان کو محسوس ہوا کہ استاد کی تشریح کے باوجود جو مصرعہ بدستور ناقابل فہم بنا ہوا تھا اس کو طالب علم کی تشریح نے قابل فہم بنا دیا ہے مگر استاد محترم اپنی ہار ماننے والے نہیں تھے۔ انھوں نے فوراً کہا:

درست، درست۔ پنجہ سل اور پنجہ شل ایک ہی بات ہے۔

حقیقت کھل جانے کے بعد آدمی اگر اس کا اعتراف نہ کرے تو گویا وہ چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو بڑا اور حقیقت کو چھوٹا ثابت کرے۔ مگر چوں کہ امر واقعہ اس کے خلاف ہے۔ اس لئے عملاً صرف یہ ہوتا ہے کہ آدمی خود چھوٹا ہو کر رہ جاتا ہے۔

مومن کا ذہن

ایک روز کا واقعہ ہے۔ میں انگریزی اخبار پڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھ پر ایک عجیب تجربہ گزرا۔ مجھ کو محسوس ہوا کہ کاغذ پر چھپے ہوئے انگریزی زبان کے الفاظ کو میں اردو زبان میں سمجھ رہا ہوں۔ میری آنکھ اگرچہ ان کو انگریزی زبان میں پڑھ رہی ہے مگر میرا ذہن ان کو اردو زبان میں لے رہا ہے۔

یہی ہر شخص کا معاملہ ہے، خواہ وہ اردو کا آدمی ہو یا کسی دوسری زبان کا۔ آدمی کسی بات کو ہمیشہ اپنی مادری زبان میں سمجھتا ہے۔ کان یا آنکھ کے راستہ سے بظاہر آدمی کے اندر ٹیبل کا لفظ داخل ہوتا ہے۔ مگر اردو کا ایک آدمی ٹیبل کو صرف اس وقت سمجھ پاتا ہے جب کہ اس کا ذہن اس کو میز میں تبدیل کرلے۔ اسی طرح انگریزی کا ایک آدمی جب میز کا لفظ سنتا ہے تو وہ اس کو صرف اس وقت سمجھتا ہے جب کہ اس کا ذہن اس کو ٹیبل کی صورت میں ڈھال لے۔ انسانی ذہن کے اندر ایک اجنبی زبان کا لفظ داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک حیرت ناک واقعہ ہوتا ہے۔ ذہن اس کو ایک انتہائی پیچیدہ نظام سے گزار کر پراسرار طور پر اس کو اپنی مادری زبان میں تبدیل کرلیتا ہے۔

یہ واقعہ تمثیل کے انداز میں بتاتا ہے کہ مومن کا معاملہ اس دنیا میں کیا ہے۔ مومن اس دنیا میں اس طرح رہتا ہے کہ ہر چیز جو اس کے اندر داخل ہوتی ہے وہ فی الفور خدائی حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ باہر جو چیز ایک مادی واقعہ ہے وہ مومن کے ذہنی سانچہ میں آکر روحانی واقعہ بن جاتی ہے۔ ایک معاملہ جو باہر بظاہر انسانی معاملہ تھا وہ مومن کے ذہن میں داخل ہوتے ہی خدائی معاملہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک دنیوی چیز مومن کے ذہن میں پہنچ کر اخروی چیز کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ مومن کا ذہن ایک انتہائی پیچیدہ کارخانہ ہے جو ہر واقعہ کو ربانی واقعہ میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اس خدائی کارخانہ میں ہر وقت ایک عظیم عمل جاری رہتا ہے۔ اس کے اندر "خام مال" داخل ہوتا ہے اور وہ "تیار مال" بن کر باہر آتا ہے۔ ایک بظاہر بے معنی چیز اس سے گزر کر ایک انتہائی با معنی چیز کی صورت میں ڈھل جاتی ہے۔ وہی شخص مومن ہے جس کا وجود اس قسم کا ایک ربانی کارخانہ بن جائے۔

معیاری دنیا

آدمی پیدائشی طور پر معیار پسند (Idealist) ہے۔ ہر آدمی ایک معیاری دنیا (Ideal world) کی تلاش میں ہے۔ مگر اس دنیا میں معیاری دنیا کا بننا ممکن نہیں۔ اس دنیا میں آدمی کو صرف معیاری نظریہ دیا جاسکتا ہے نہ کہ معیاری دنیا۔

معیاری دنیا بننے کی جگہ صرف آخرت ہے۔ موجودہ دنیا امتحان کی حکمت کے تحت بنائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بہت سی محدودیتیں (Limitations) ہیں۔ یہ محدودیتیں خود خالق کی طرف سے ہیں اور ان کی موجودگی میں یہاں معیاری دنیا بننا ممکن نہیں۔ اسی کے ساتھ امتحان کی مصلحت کے تحت یہاں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے۔ یہاں اگر نیک لوگوں کو عمل کی آزادی ہے تو یہاں برے لوگوں کو بھی چھوٹ ملی ہوئی ہے کہ وہ جو چاہیں کریں۔ چنانچہ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ نیک لوگ ایک نقشہ بناتے ہیں اور برے لوگ شرارتیں کرکے اس نقشہ کو توڑ ڈالتے ہیں۔

امتحان کا تصور موجودہ دنیا کو سمجھنے کی کنجی ہے۔ فلاسفہ اور مفکرین اس کنجی کو نہ پاسکے۔ اس لئے دنیا کو سمجھنے میں بھی وہ ناکام رہے۔ انھوں نے موجودہ دنیا میں اپنی پسند کی دنیا بنانی چاہی۔ مگر "ناقص دنیا" میں "کامل دنیا" نہیں بن سکتی تھی، چنانچہ ان کے حصہ میں ذہنی انتشار کے سوا اور کچھ نہ آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں معیاری دنیا نہیں بن سکتی۔ معیاری دنیا بننے کی جگہ آخرت ہے۔ یہاں صرف یہ ممکن ہے کہ لوگوں کو خدا کی اسکیم سے آگاہ کیا جائے اور ان کو آخرت پسندی کی زندگی گزارنے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اس دعوت کے نتیجہ میں اگر انسانوں کی بہت بڑی تعداد دین حق پر آجائے تو ان کے اجتماع سے یقیناً ایک ایسا معاشرہ بن جائے گا جو نسبتاً بہتر معاشرہ ہوگا۔ نیز اگر حالات نے مساعدت کی تو یہ گروہ غیر دینی نظام کے اوپر غلبہ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ اور وہ چیز بھی قائم ہو سکتی ہے جس کو دینی حکومت کہا جاتا ہے۔

تاہم اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ یہ معاشرہ یقینی طور پر "معیاری" معاشرہ ہوگا۔ اور نہ اس کی کوئی ضمانت ہے کہ وہ مستقل طور پر باقی رہے گا۔ یہ ساری چیزیں خدا نے آخرت کی دنیا میں رکھ دی ہیں اور جو چیزیں مالک کائنات نے اگلی دنیا میں رکھ دی ہوں ان کو ہم موجودہ دنیا میں کبھی نہیں پاسکتے۔

مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۶۶ء کی سردیوں کا ایک دن تھا۔ میں نارتھ ایسٹرن ریلوے کے ایک اسٹیشن پر اترا۔ کچھ دور آگے چلا تھا کہ سامنے نظر آیا کہ ایک پیدل قافلہ سڑک کو پار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ قدیم وضع کا لباس، حلیہ سے دینداری اور سادگی نمایاں، بستر اور ضروری سامان کا بنڈل اپنے اوپر لادے ہوئے چلا جا رہا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہے جو اچانک زمین پر اتر آئی ہے۔ شاید مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ کون لوگ تھے۔ کیونکہ یہ اب عام طور پر لوگوں کے لیے ایک مانوس منظر بن چکا ہے۔ ملک میں کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جنہیں کبھی نہ کبھی اس منظر سے سابقہ نہ پڑا ہو۔ اب اس طرح کی شکلیں دیکھ کر ہر شخص خود سمجھ جاتا ہے کہ یہ کن لوگوں کا قافلہ ہے اور کس مقصد کے لیے ادھر سے اُدھر سفر کر رہا ہے۔

اس طرح کے بے شمار قافلے آج ساری دنیا میں اپنے قدموں کو دین کی راہ میں گرد آلود کر رہے ہیں۔ شاید ۲۴ گھنٹے میں کوئی وقت ایسا نہیں ہوگا جب کہ دین کی یہ نقل وحرکت کہیں نہ کہیں جاری نہ ہو۔ یہ عظیم حرکت جو تبلیغ کے نام سے چل رہی ہے اور جس نے آج لاکھوں انسانوں میں ایک نیا جوش اور نئی ہلچل پیدا کر دی ہے، اس کا آغاز کرنے والا ایک ایسا شخص تھا جو اپنے لاغر جسم، پستہ قد، اور غیر نمایاں شخصیت کے ساتھ لکنت کا بھی شکار تھا۔ اور مشکل سے اپنی ہی بات کو صاف طور پر ادا کر سکتا تھا۔ یہی وہ حیرت انگیز وجود ہے جس کو لوگ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانتے ہیں۔ اور اس نے جو دینی نقل وحرکت پیدا کی، اس کو عوام کی زبان میں "تبلیغی جماعت" کہا جاتا ہے۔ مولانا اگرچہ جسمانی اعتبار سے کمزور اور دبلے آدمی تھے۔ مگر اس کمزور جسم کے اندر ایک انتہائی طاقتور چیز چھپی ہوئی تھی، اور وہ ہے لوگوں کو دین کی راہ پر ڈالنے کا بے پناہ جذبہ۔ یہی چیز تھی جس نے ایک کمزور شخص سے وہ کام کرا دیا جو طاقتوروں سے نہیں ہو سکتا۔

ابتدائی حالات

انیسویں صدی کے آخر میں اگر کوئی شخص دہلی کی کسی اونچی عمارت پر چڑھے تو اس کو شہر کے باہر جنوبی سمت میں

دور تک پھیلے ہوئے جنگلوں کے درمیان چند بے ترتیب عمارتیں نظر آئیں گی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں نظام الدین اولیاء کا مزار ہے اور اسی نسبت سے یہ جگہ بستی نظام الدین کے نام سے مشہور ہے۔ یہیں اس وقت ایک بزرگ رہا کرتے تھے جن کا نام مولانا محمد اسماعیل (م ۱۸۹۸ء) تھا۔ ان کا معمول تھا کہ جو مزدور اس ویرانہ میں آنکلتے ان کا بوجھ اتار کر رکھتے اور اپنے ہاتھ سے ڈول کھینچ کر اُن کو پانی پلاتے، پھر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرتے کہ اللہ نے اپنے بندوں کی اس خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔

مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی انہیں بزرگ کے صاحبزادے تھے۔ جن کی ولادت ۱۳۰۳ھ اور وفات ۱۳۶۳ھ (۱۹۴۴ء) میں ہوئی۔

مولانا محمد الیاس صاحب خاندان ولی اللٰہی سے تعلّق رکھتے تھے۔ یہ وہی خاندان ہے جس کے متعلق اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ ہندستان میں آلِ تیمور کی غلط سیاست نے دین اسلام کو جو نقصان پہونچایا تھا اس کے تدارک اور اصلاح کا کام اللہ تعالیٰ نے اسی خاندان کے ذریعے لیا۔ مولانا الیاس صاحب نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں زندگی میں ہماہمی پیدا کرنے کے لیے لوگوں کو فرضی واقعات کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ کئی کئی پشت سے ان کے خاندان اور رشتہ داروں میں علماء اور مجاہدین کی شاندار روایات چلی آرہی تھیں ان کے گھر کے باہر اور اندر کی مجلسیں سید صاحب اور شاہ عبد العزیز صاحب کے خاندان کے قصّوں سے گرم تھیں۔ ان بزرگوں کے واقعات مردوں اور عورتوں کی زبانوں پر تھے۔ اور گھر کی بیبیاں بچّوں کو طوطا مینا اور پریوں کی کہانیاں سنانے کے بجائے ان کے روح پرور واقعات سناتی تھیں۔ گھر میں ہر طرف نماز، روزہ، تلاوت اور ذکر کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ گھر کی کوئی بڑی بی خوش ہوتیں تو یہ نہ کہتیں کہ "میرا بچّہ آئی۔ سی۔ ایس میں جائے گا۔" بلکہ ان کی زبان سے نکلتا —— "بیٹے مجھے تجھ سے صحابہ کی خوشبو آتی ہے" یہ تھے وہ ابتدائی خاندانی حالات جن میں مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی پرورش ہوئی۔

آپ کے گھر پر ایک تجارتی کتاب خانہ تھا جس کا انتظام آپ کے بڑے بھائی مولانا یحییٰ صاحب کرتے تھے۔ مولانا الیاس صاحب یوں بھی بچپن سے کمزور ہونے کی وجہ سے جسمانی مشقّت کا کام نہ کرسکتے تھے۔ اور وہ اس میں کچھ حصّہ نہیں لیتے تھے۔ ان کا وقت زیادہ تر مطالعہ اور دینی مشاغل میں گزرتا تھا اس کے برعکس بڑے بھائی کافی محنت سے کتاب خانہ کے امور انجام دیتے تھے۔ ایک روز کتاب خانہ کے منتظم نے کہا "مولوی الیاس کتاب خانہ کے کاموں میں کچھ ہاتھ نہیں بٹاتے۔ کوئی خدمت ان کے ذمّہ بھی کردینی چاہیئے"۔ بڑے بھائی نے تکدّر کے ساتھ جواب دیا —— "حدیث میں آیا ہے کہ ھَلْ تُرزَقُونَ اِلّا بِضُعَفَائِکُم (تم کو جو رزق ملتا ہے وہ تمہارے کمزور افراد ہی کی برکت تو ہوتی ہے) میرا اعتقاد ہے کہ مجھے اسی بچّہ کی

برکت سے رزق مل رہا ہے۔ اس لیے آئندہ اس قسم کی بات مجھ سے نہ کہی جائے۔"

اخلاص اور دینداری کے اس ماحول کا نتیجہ یہ تھا کہ مولانا کی پرورش اس طرح ہوئی گویا وہ دین کے گہوارے میں پل رہے ہیں۔ ایسی حالت میں جذبات کا دین کی راہ پر مڑ جانا بالکل فطری تھا۔ مولانا کے ایک ہم درس بیان کرتے ہیں کہ بچپن میں جب وہ ان کے ساتھ مکتب میں پڑھتے تھے، ایک دن آپ لکڑی لے آئے اور کہا ــــ" آؤ میاں ریاض الاسلام! چلو بے نمازیوں پر جہاد کریں۔"

مکتب کی تعلیم سے فارغ ہو کر مولانا نے قدیم طرز پر عربی و دینی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم (سہارن پور) میں استاد مقرر ہوئے۔ مگر قدرت کو منظور تھا کہ اب آپ کو اگلے مرحلہ کی تربیت گاہ میں پہونچایا جائے۔ پہلے ذکر آچکا ہے کہ آپ کے والد صاحب دہلی کے پاس بستی نظام الدین میں رہتے تھے۔ وہاں انہوں نے ایک چھوٹا سا مدرسہ جاری کیا تھا۔ جس میں کچھ غریبوں کے بچے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد آپ کے بھائی مولانا محمد صاحب نے اس مدرسہ کو سنبھالا۔ ۱۳۲۶ھ میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس وقت جب آپ اس سلسلہ میں نظام الدین گئے تو وہاں لوگوں نے اصرار کیا کہ اب یہیں قیام کریں اور والد اور بھائی کی جگہ، جو ان کی وفات سے خالی ہوئی ہے، اس کو پُر کریں۔ آپ نے اس درخواست کو منظور کر لیا۔

یہاں سے آپ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جب کہ میواتیوں سے تعلق کی وجہ سے آپ کو تبلیغی تحریک چلانے کی طرف توجہ ہوئی۔ تبلیغ کا ابتدائی محرک میواتی مسلمان بنے۔ اس کے بعد یہ کام دوسرے تمام مقامات پر پھیل گیا۔

میواتیوں میں کام

دہلی کے جنوب کا وہ علاقہ جس میں قدیم زمانے سے میو قوم آباد ہے، میوات کہلاتا ہے۔ یہ تقریباً اسی قسم کی ایک قبائلی آبادی تھی جیسا کہ عرب کے قدیم بدوؤں کے سلسلے میں ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں۔ ایک جاہل اور اجڈ قوم جو غالباً حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء و متبعین کی کوششوں سے مسلمان ہو گئی تھی۔ مگر عملاً وہ اسلام سے دور تھے۔ بجز اس خیال کے کہ "وہ مسلمان ہیں" اور کوئی اسلامی چیز ان کے اندر باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ناہر سنگھ اور بھوپ سنگھ جیسے نام رکھتے، ان کے سروں پر چوٹیاں ہوتیں، ان کے یہاں مورتیاں پوجی جاتیں، وہ ہندوؤں کے تیوہار اور تقریبات مناتے، دیوی دیوتاؤں کے نام پر قربانی چڑھاتے، شب برات میں ان کے یہاں سید سالار مسعود غازی کا جھنڈا اٹھتا تھا۔ مگر وہ بھی ایک بُت تھا جو پوجا جاتا تھا۔ انہیں کلمہ تک یاد نہ تھا۔ حتیٰ کہ نماز کی صورت سے وہ اس

قدرنا آشنا تھے کہ کبھی کوئی مسلمان اتفاق سے ان کے علاقے میں پہونچ گیا اور اس نے نماز پڑھی تو گاؤں کے عورت، مرد، بچے سب اس کے گرد یہ دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے کہ یہ شخص آخر کیا کر رہا ہے۔ اس کے پیٹ میں درد ہے یا اس کو جنون ہو گیا ہے کہ بار بار اٹھتا بیٹھتا اور جھکتا ہے۔ ان کی تہذیب کا یہ عالم تھا کہ عورت مرد اکثر نیم برہنہ گھومتے تھے۔ چوری ڈکیتی اور رہزنی ان کا پیشہ تھا۔ آپس کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کے درمیان لمبی لمبی خوں ریز لڑائیاں ہوتی رہتی تھی۔ وہ فطرتاً جفاکش اور بہادر تھے۔ مگر علم اور تربیت کی کمی نے انہیں جنگلی قبائل کی سطح سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ میجر پاؤلٹ، جو انیسویں صدی کے آخر میں ریاست الور کا افسر بندوبست تھا، کے الفاظ میں:

"میو اپنے عادات میں آدھے ہندو ہیں،" [1]

دہلی کی مسلمان سلطنت کے ابتدائی دور میں میواتی بہت تکلیف دہ عنصر بن گئے تھے۔ انہوں نے دہلی کے اوپر تاخت و تاراج شروع کر دی تھی۔ ان کے خوف سے راجدھانی کے دروازے سرِ شام بند ہو جاتے شام کو شہر پناہ سے باہر نکلنے کی کوئی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ غیاث الدین بلبن نے ان کے خلاف ایک زبردست مہم بھیجی جس میں میواتیوں کی بڑی تعداد قتل ہوئی۔ بعد کے حالات بھی بتاتے ہیں کہ انگریزی حکومت کے افسران اور الور اور بھرت پور کی ہمسایہ ریاستیں وہاں امن و امان قائم کرنے میں ناکام رہی تھیں۔

۱۹۲۱ء کے زمانے میں مزید ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ آریہ مبلغین سیکڑوں کی تعداد میں اٹھ کھڑے ہوئے جن کا مقصد یہ تھا کہ ہندستان کے وہ باشندے جنہوں نے پہلے اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا انہیں دوبارہ اپنے مذہب کی طرف واپس لایا جائے۔ ہر طرف ارتداد کی ہوا پھیلنے لگی اور جاہل نو مسلم دیہاتی علاقوں میں آریوں کی کامیابی کی خبریں آنے لگیں۔

بستی نظام الدین عین میوات کے دہانے پر واقع تھی۔ اور یہاں کے مدرسہ میں ان کے کچھ بچے پڑھتے تھے۔ اسی کے ساتھ مولانا الیاس صاحب کے والد بزرگوار اور آپ کے بھائی صاحب مرحوم کے تعلق سے کچھ میواتی عقیدت مند بھی ہو گئے تھے۔ وہ آتے جاتے رہتے تھے۔ مولانا الیاس صاحب نے میواتیوں کی افسوسناک حالت دیکھی تو ان کے اندر اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا۔ آپ کے دونوں پیشرو (والد صاحب اور بھائی صاحب) دینی تعلیم کے ذریعہ پہلے سے بھی ان کی اصلاح کی کوشش کر رہے تھے۔ فطری طور پر آپ کا پہلا ذہن اسی طرف گیا کہ اس سلسلے کو جاری رکھنا ان کی اصلاح کا حقیقی

ذریعہ ہے۔ آپ نے اس میں اتنا اور اضافہ کیا کہ خود میوات کے اپنے علاقہ میں بھی دینی مکاتب و مدارس قائم کرنے کی تحریک چلائی۔

یہ دوسرا جزء میواتیوں کے لیے سخت مشکل تھا۔ کیونکہ وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ بچہ کو کھیتی باڑی اور جانوروں کی دیکھ بھال سے ہٹا کر مدرسہ میں بٹھادیں۔ تاہم آپ نے کوشش جاری رکھی۔ تبلیغ سے لے کر خوشامد تک ہر طریقہ اختیار کیا۔ میواتیوں سے کہا کہ "تم بچے دے دو، معلّمین کی تنخواہ میں لاؤں گا۔" بالآخر میوات میں سیکڑوں ایسے مکتب قائم ہو گئے جن میں قرآن اور ابتدائی دینی تعلیم ہوتی تھی۔

اس کے بعد ایک واقعہ ہوا جس نے آپ کی کوششوں کے رُخ کو بالکل موڑ دیا۔ ایک بار آپ میوات کے سفر میں تھے۔ ایک مقام پر مولانا کے سامنے بڑی تعریف کے ساتھ ایک نوجوان پیش کیا گیا کہ یہ میوات کے فلاں مکتب سے فارغ ہو کر نکلے ہیں۔ دیکھا تو ڈاڑھی منڈی ہوئی ہے اور چہرہ اور وضع قطع میں کہیں اسلامیت کا کوئی نشان نہیں، یہ واقعہ مکاتب کی عملی ناکامی کی تصویر تھا۔ مکاتب کے نتائج کے بارے میں جو بے اطمینانی آپ کو رہا کرتی تھی۔ وہ اب پوری شدّت کے ساتھ اُبھر آئی۔ مکاتب کے قیام سے بلاشبہ یہ فائدہ تھا کہ آہستہ آہستہ لوگوں کے اندر مولانا کی عقیدت بڑھ رہی تھی، اور ایک دوسرا کام جو مولانا وہاں کرنا چاہتے تھے وہ بھی کسی قدر ہو رہا تھا۔ یعنی میواتیوں کے آپس کے لڑائی جھگڑوں کو چکانا اور باہم صلح کرانا۔ اس میں ان کی کامیابی کا یہ عالم تھا کہ میوات کے لوگ کہنے لگے تھے ــــ "یہ شخص دیکھنے میں تو ایک مشتِ استخواں ہے۔ مگر جس معاملے میں پڑ جاتا ہے، چٹکیوں میں اس کو سُلجھا دیتا ہے۔ اور معلوم نہیں کیا بات ہے کہ بڑے بڑے ضدّی اس کے کہنے سے فوراً مان جاتے ہیں۔"

مگر اصل مسئلہ میواتیوں کی دینی بیداری کا تھا۔ اور اس معاملے میں مکاتب کی ناکامی اپنی جگہ بدستور باقی تھی۔ غور و فکر کے بعد آپ پر کھلا کہ اصل رکاوٹ یہ ہے کہ موجودہ طریق کار کے تحت ہم یہ کرتے ہیں کہ میواتیوں کو ان کے مشاغل اور ماحول میں رکھ کر انہیں دین کا سبق پڑھانا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم تو انہیں محنت اور عرق ریزی سے دین کی باتیں بتاتے ہیں۔ مگر اس کے چند ہی لمحے بعد جب وہ اپنے گھر اور اپنے ماحول میں پہونچتے ہیں تو وہاں دوسری قسم کی باتیں انہیں گھیر لیتی ہیں اور پھر خود بخود سفیدی پر سیاہی پھر جاتی ہے۔ اس کا واحد حل جو مولانا کو نظر آیا وہ یہ کہ میواتیوں کی جماعت بنا کر انہیں ان کے ماحول سے نکالا جائے۔ اور پھر مسجدوں میں، دینی مدارس میں، بزرگوں کی صحبتوں میں، اور وعظ و تلقین کے ماحول میں رکھ کر انہیں تعلیم دی جائے اور انہیں ایک عرصہ تک ذکر اور نماز اور دعا میں مشغول رکھ کر متاثر کرنے کی

کوشش کی جائے۔ اب انہوں نے اس دوسرے طریقے کے مطابق کام شروع کر دیا۔

اس کام میں ابتدائً پہلے سے بھی زیادہ مشکلیں پیش آئیں۔ جس میواتی کا یہ حال تھا کہ اس کو اپنا بچہ مقامی مدرسہ میں دینا گوارا نہیں ہوتا تھا، وہ خود اپنا وطن چھوڑ کر اور اپنا وقت نکال کر باہر جانے کے لیے کس طرح راضی ہوتا، مگر مولانا کا اخلاص، مسلسل کوشش، دعائیں اور گریہ وزاری نے بالآخر اس کو ایسا رواج دیا کہ سارے میوات میں ایک نئی حرکت پیدا ہو گئی۔

اس سرکش قوم کو مولانا نے کس طرح رام کیا۔ اس کا اندازہ دو واقعات سے ہوگا۔ ایک مرتبہ دورانِ تبلیغ آپ نے ازراہِ محبت ایک شخص کے اوپر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ آگ بگولہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ اگر اب کی تم نے ہاتھ لگایا تو میں لٹھ مار دوں گا۔ آپ نے فوراً اس کے پاؤں پکڑ لیے اور فرمایا کہ —"پاؤں کو تو نہیں کہا تھا" اس کے بعد اس کا غصہ کافور ہو گیا اور فوراً نرم پڑ گیا۔ اسی طرح آپ ایک بار ایک میواتی پر تبلیغ کر رہے تھے کہ وہ بگڑ گیا اور آپ کو ایک گھونسہ مار دیا۔ مولانا الیاس صاحب دُبلے کمزور آدمی تھے۔ گھونسہ کی تاب نہ لا کر زمین پر گر پڑے۔ کچھ دیر بعد جب ان کے حواس بجا ہوئے تو وہ گرد جھاڑ کر اٹھے اور میواتی کا دامن پکڑ لیا اور کہا:

"اچھا تم تو اپنا کام کر چکے، اب میری سنو"

یہ دیکھ کر میواتی آپ کے قدموں پر گر پڑا اور بولا "مولوی مجھے معاف کر ورنہ میری بخشش نہیں ہو گی"

اسی اخلاص اور اخلاق کا نتیجہ تھا کہ بالآخر لوگوں کے دل کھنچے۔ میواتیوں کی کثیر تعداد آپ کے ساتھ ہو گئی۔ ان کے قافلے جوق در جوق اپنے علاقوں سے نکل کر نظام الدین، سہارن پور، اور دوسرے مقامات کو جانے لگے اور ہفتوں اور مہینوں تک ان کی زندگیاں دینی تعلیم و تربیت کے سائے میں گزرنے لگیں۔ نتیجے نے بتایا کہ مولانا کا سوچنا صحیح تھا۔ اس کورس سے نکل کر جو لوگ میوات لوٹتے وہ بڑی حد تک بدل چکے ہوتے۔ ماحول سے متاثر ہونے کے بجائے ماحول کو بدلنے کا جذبہ ان کے اندر بیدار ہو چکا ہوتا تھا۔

اب میوات کی فضا بدلنے لگی۔ پورے علاقے میں دین کی رغبت پیدا ہو گئی۔ جہاں میلوں تک کوئی مسجد نظر نہیں آتی تھی وہاں گاؤں گاؤں مسجدیں بن گئیں۔ مکاتب و مدارس نہ صرف تعداد میں بڑھے بلکہ اب انہیں واقعی میوؤں کے درمیان دینی تعلیم و تربیت کے ادارے کا مقام حاصل ہو گیا۔ ہندوانہ وضع و لباس کی جگہ اسلامی وضع و لباس ہر طرف نظر آنے لگا۔ ہاتھوں کے کڑے اور کانوں کی مُرکیاں

اترنے لگیں۔ بے کہے لوگوں نے ڈاڑھیاں رکھنی شروع کر دیں۔ تقریبات سے مشرکانہ رسوم کا خاتمہ ہو گیا۔ سود خواری کم ہو گئی۔ شراب نوشی کا وجود مٹ گیا۔ قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کی واردات میں کمی آ گئی۔ گاؤں کے گاؤں ایسے ہو گئے جہاں ایک بچہ بھی بے نمازی نہیں تھا۔ ان کی معاشرت، ان کے برتاؤ، ان کے لین دین، غرض ہر چیز میں فرق آ گیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ قوم جو پہلے دینی شعور سے بالکل بیگانہ تھی۔ اس کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو گیا کہ وہ دوسروں کو خدا کے دین سے آگاہ کرے۔ ان کی سیدھی سادی زبانوں سے دین کی باتیں سُن کر ایسا محسوس ہونے لگا کہ تاریخ اپنے اوراق الٹ رہی ہے۔ اور آغاز اسلام میں عرب کے نومسلم بدو دوبارہ پیدا ہو کر زمین کے اوپر چلنے پھرنے لگے ہیں۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک بزرگ ستمبر ۱۹۲۹ء میں میوات کے حالاتِ کا مشاہدہ کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے انہوں نے ایک جاہل میواتی کو روک کر پوچھا —— "یہ تبلیغی دورے تم کس لیے کر رہے ہو" اس نے جواب دیا:

"ہم جہالت میں پڑے ہوئے تھے۔ نہ ہم کو خدا کی خبر تھی نہ رسول کی۔ اس مولوی کا خدا بھلا کرے کہ اس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دوسرے بھائیوں تک بھی یہ نعمت پہونچائیں جو ہمیں ملی ہے۔"

میواتی کے یہ سیدھے سادے الفاظ سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔

مولانا کی شخصیت

کسی کام کی کامیابی کے لیے طریق کار کی صحت کے ساتھ کارکنوں کا اخلاص اور تعلّق بھی ضروری ہے۔ یہ مولانا الیاس صاحب کی بے تاب طبیعت نے فراہم کر دیا۔ مولانا کو جن لوگوں نے دیکھا ہے ان کی متفقہ شہادت ہے کہ وہ اس قدر بے چین اور مضطرب آدمی تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ گوشت پوست کا مجسمہ نہیں بلکہ درد اور تڑپ کا مجسمہ ہیں۔ مولانا کے ایک قدیم رفیق ایک بار نظام الدین گئے۔ اس وقت مولانا الیاس صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ انہوں نے گھر میں مولانا الیاس صاحب کی زوجہ محترمہ کے یہاں کہلایا کہ مولانا کی کوئی خاص بات جو آپ کو یاد ہو بتائیے۔ محترمہ نے اندر سے کہلایا:

"جب میری شادی ہوئی اور میں رخصت ہو کر مولانا کے گھر گئی تو میں نے دیکھا کہ مولانا راتوں کو بہت کم سوتے ہیں۔ ان کی راتیں بستر پر کروٹ بدلنے اور آہ بھرنے میں گزرتی تھیں۔ میں نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ آپ کو راتوں کو نیند نہیں آتی۔ مولانا نے ایک آہ بھری اور فرمایا —— کیا بتاؤں اگر تم کو وہ بات معلوم ہو جائے تو جاگنے والا ایک نہ رہے، دو ہو جائیں۔"

مولانا کی ساری زندگی گواہی دیتی ہے کہ وہ سراپا دردِ دین تھے ۔ وہ اگرچہ لکنت کی وجہ سے، نیز اکثر قدیم طرز کی زبان اور اصطلاحات میں بولنے کی وجہ سے عام لوگوں کو اپنی بات بخوبی سمجھا نہیں پاتے تھے ۔ مگر جب وہ بولتے تو شدت احساس کی وجہ سے ان کا وجود مجسم بیان اور اظہار بن جاتا ۔ اکثر ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے، آہیں بھرتے اور فرماتے ۔ "میرے اللہ میں کیا کروں، کچھ ہوتا ہی نہیں" اس قدر کمزور اور لاغر تھے کہ دیکھنے والوں کو ترس آتا ۔ مگر اس کے باوجود تندرست اور طاقتور لوگوں سے زیادہ کام کرتے ۔ فرمایا کرتے تھے ۔ " دین کے فروغ کے لیے جان دینے کے شوق کو زندہ کرنا اور جان کو بے قیمت کر دینا ہماری تحریک کا خلاصہ ہے ۔"

اپنے مقصد کے پیچھے آرام اور کھانا پینا تک بھول جاتے ۔ میوات کے ناہموار علاقوں میں ۲۰-۲۰ میل اور ۲۵-۲۵ میل تک پیدل چلے جاتے ۔ کھانا موجود ہونے کے باوجود بعض اوقات اس ہنگامی زندگی کی وجہ سے کھانے کی نوبت نہ آتی ۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جمعہ کے دن نظام الدین سے کھانا کھا کر روانہ ہوئے اور اتوار کو نظام الدین واپس آکر کھانا کھایا ۔ راتوں کو جاگنا، پہاڑیاں عبور کرنا، میوات کے میدانوں میں کبھی گرم لُو کی لپٹیں اور کبھی زمستانی ہوا کے سرد جھونکوں کا مقابلہ کرنا، یہ ان کی زندگی تھی ۔ اس طرح کے پُرمشقت سفروں میں کبھی دیکھتے کہ ساتھی گھبرا گئے ہیں تو فرماتے :

"جبل جُہد کے پرلی طرف خدا ہے جس کا جی چاہے مل لے ۔"

بیماری کے عالم میں کوئی خیریت پوچھتا تو فرماتے :

"بھئی تندرستی بیماری تو انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے اس میں کیا خیریت اور کیا بے خیریت ۔ خیریت تو جب ہے کہ جس کام کے لیے پیدا کئے گئے ہیں وہ کام ہو ۔"

ایک مرتبہ مولانا کے وطن کاندھلہ سے کچھ اعزہ عیادت کے لیے آئے ۔ مولانا نے پوچھا کس لیے آئے کہنے لگے آپ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے ۔ فرمایا ۔ " جو مٹنے کے لیے بنا ہے اس کی خیریت پوچھنے کے لیے کاندھلہ سے یہاں تک آؤ ۔ اور رسول کریم کا دین جو مٹنے والا نہیں، وہ مٹایا جا رہا ہے، اور تم اس کی خبر نہیں لیتے ۔" بیماری میں ڈاکٹر بولنے سے منع کرتے تو فرماتے ۔ " تبلیغ کے لیے بول کر مر جانا پسند کرتا ہوں ۔ بہ نسبت اس کے کہ اس سے خاموش رہ کر صحت حاصل کروں ۔" ایک صاحب کو طلب خیریت کے سلسلے میں جواب دیتے ہوئے خط میں لکھا :

"طبیعت میں سوائے تبلیغی درد کے اور خیریت ہے ۔"

مولانا کو تبلیغ کے کام سے اس قدر تعلق تھا کہ جب دیکھتے کہ ان کی ساری کوشش کے بعد جو

لوگ ان کے گرد جمع ہوئے ہیں وہ زیادہ تر جاہل یا معمولی پڑھے لکھے لوگ ہیں تو سخت غمگین ہوتے، آخری بیماری میں ایک مرتبہ گہرے تاثر کے ساتھ فرمایا:

"کاش علماء اس کام کو سنبھال لیتے اور پھر ہم چلے جاتے۔"

لوگوں کے ساتھ رعایت کا یہ عالم تھا کہ ریل کے سفر میں ایک بار مغرب کے نوافل پڑھتے وقت ایک رفیق نے مسافروں کو سامنے سے گزرنے سے روکنے کا انتظام کیا۔ آپ نے منع فرمایا اور کہا کہ یہ حقوق عامہ ہیں، تم دوسرے کو گزرنے سے نہ روکو بلکہ سُترہ کا انتظام کرو۔ کاندھلہ کے سفر میں ایک مرتبہ بھیڑ کی وجہ سے آپ سکنڈ کلاس میں بیٹھ گئے۔ ٹکٹ تھرڈ کلاس کا تھا۔ خیال ہوا کہ ٹکٹ چیک کرنے والا آئے گا تو ٹکٹ بنوا لیا جائے گا۔ وہ آیا تو اس نے ایسی بے ڈھنگی گفتگو کی کہ مولانا کو غصہ آگیا۔ اور اس کو ڈانٹ دیا۔ ٹکٹ بنانے کے بعد وہ چلا گیا۔ تو مولانا انعام الحسن صاحب نے جو اس وقت ساتھ تھے کہا کہ حضرت، اس کو تو کہنے کا حق تھا۔ ان لصاحب الحق مقالاً (جس کا حق آتا ہو وہ کہنے سننے کا مجاز ہے) مولانا نے فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور اگلے اسٹیشن پر اتر کر اس ٹی ٹی ای سے معذرت کی اور معافی مانگی۔

اسی کے ساتھ خدا سے تعلق اور آخرت کے استحضار کا یہ عالم تھا کہ نمازیں انہیں لذت ملتی۔ پہاڑی پر چڑھتے اور اوپر پہونچ کر جب تمام ساتھی تھک کر بیٹھ جاتے، مولانا فوراً نماز کی نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے۔ انتقال کے بعد جب غسل دیا گیا اور خوشبو لگائی جانے لگی تو ایک رفیقِ خاص کی زبان سے بے اختیار نکلا — "پیشانی پر اچھی طرح خوشبو لگاؤ، یہ گھنٹوں سجدہ میں ٹکی رہتی تھیں۔"

آپ کی یہی عبادتیں، قربانیاں، اور خلق اللہ سے آپ کی محبت تھی جس نے آپ کی محنت اور آپ کے کام میں وہ تاثیر پیدا کر دی کہ آج جو لوگ تبلیغ کے کام کے پھیلاؤ اور اس کے حیرت انگیز نتائج کو دیکھتے ہیں، ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مادی اصطلاحوں میں ان واقعات کی کس طرح تشریح کریں۔

ایک مکتوب میں مولانا نے لکھا:

"عاداتِ خداوندی عموماً دین میں اپنی جدوجہد کی مقدار کے ساتھ وابستہ ہیں۔ آدمی کسی مقصد کے لیے جتنا اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے اور تکالیف کو جھیلنے کے ذریعہ اپنے حالات، جوارح، قلب اور قوتوں کی شکستگی اور تعب وانکسار کو پہونچتا ہے، اتنا ہی حق تعالیٰ کی رحمت کے نزول کا سبب ہوتا ہے۔ انا عند المنکسرۃ قلوبھم۔ کسی راہ کی ذلت کو اٹھائے بغیر اس کی عزت کو پہونچنا عادۃً ہوتا نہیں۔"

یہ الفاظ درحقیقت خود کہنے والے کی تصویر ہیں۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ آپ نے خود کو دین کی راہ میں

گھلا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی زندگی اور آپ کے کلام میں عجیب کشش پیدا ہو گئی۔ مولانا نے جو بات اوپر کے اقتباس میں کہی ہے اس کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ آدمی جب کسی کام میں اپنے کو فنا کیے ہوئے ہو، اس وقت اس کی شخصیت بے پناہ ہو جاتی ہے۔ اس کی زبان سے تیر و نشتر کی باتیں نکلنے لگتی ہیں جو دلوں میں گھستی ہیں اور روحوں کو بے چین کر دیتی ہے۔ دلوں کو چھیدنے والے کلمات اسی کی زبان سے نکل سکتے ہیں جس کا دل مقصد کے غم میں چھلنی ہو گیا ہو۔

مولانا کے چند کلمات سے اس کی مزید وضاحت ہو سکے گی۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"سمجھے مولوی جی، یہ کام قرن اول کا ہیرا ہے۔ اس کے لیے اپنی جانیں قربان کر دو اور اپنا سب کچھ مٹا دو۔ اس کے لیے جتنا زیادہ قربان کرو گے اتنا زیادہ پاؤ گے"

کچھ لوگ مولانا سے ملنے گئے اور مہمان کی طرح رہ کر واپس چلے گئے۔ ان کو کہلایا "تم لوگ آئے اور چند روز مسند نشینی کر کے چل دیے۔ یاد رکھو اس راہ میں بھوک اور پیاس کی تکلیفات برداشت کرنے کی ضرورت ہے۔ اس راہ میں اپنا پسینہ بہاؤ اور خون بہانے کے لیے تیار رہو"

ایک خط میں اس پر افسوس کرتے ہوئے کہ فی گھر ایک آدمی بھی لوگ تبلیغ کے لیے نہیں دے رہے ہیں لکھتے ہیں:

"عیسیٰ! تم غور تو کرو۔ دنیا فانی میں کام کے لیے تو گھر کے سارے افراد ہوں اور اس کے لیے صرف ایک آدمی کو کہا جائے اور اس پر بھی نباہ نہ ہو، تو آخرت کو دنیا سے گھٹایا یا نہیں گھٹایا۔"

ایک مرتبہ لکھنؤ میں تبلیغی جلسہ ہوا۔ جلسہ کے بعد تحریک ہوئی کہ کچھ لوگ جماعت بنا کر کانپور کے لیے جائیں۔ مگر اعلان کے باوجود کوئی نام نہیں دے رہا تھا۔ مولانا بے قرار ہو کر کھڑے ہو گئے اور لوگوں کو آمادہ کرنا شروع کر دیا۔ حاجی ولی محمد صاحب کئی روز سے صاحب فراش تھے۔ بواسیر کی شکایت نے نقاہت پیدا کر دی تھی۔ آپ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا، تم کیوں نہیں جاتے۔ انہوں نے جواب دیا۔ "میں تو مر رہا ہوں"۔ فرمایا "مرنا ہی ہے تو کانپور جا کر مرو"

یہ چند جملے محض سمجھنے کے لیے نقل کر دیئے گئے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے الفاظ کبھی بھی اپنی اصل حیثیت کے ترجمان نہیں ہوتے۔ کیونکہ جب اس طرح کا جملہ کہا جاتا ہے تو وہ کاغذ پر لکھ کر کسی کو نہیں دیا جاتا، بلکہ کہنے والا سامنے موجود ہوتا ہے اور سننے والا براہ راست اس کے کلمات کو سن رہا ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں بات بالکل دوسری ہوجاتی ہے۔ اس وقت یہ الفاظ محض الفاظ نہیں ہوتے بلکہ اس میں دو اور چیزیں شامل ہوجاتی ہیں۔ اور وہ ہیں ـــــ جذبات اور شخصیت۔ اس وقت وہ ایک ایسی حقیقت ہوتی ہے جس میں درد، خیر خواہی اور اخلاص کے ساتھ ایک زندہ شخصیت کا پورا وزن بھی شامل رہتا ہے۔ ایسے کلمات جب وجود میں آتے ہیں تو فضا میں رعشہ پیدا کر دیتے ہیں وہ سوتوں کو بیدار کر دیتے ہیں۔ کٹر سے کٹر طبیعتیں رام ہوجاتی ہیں۔ غفلت میں پڑے ہوئے چونک اٹھتے ہیں، فطرت میں چھپی ہوئی عبودیت اس طرح جاگ اٹھتی ہے کہ ساری زندگی کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ ایسے ہی کلمات کے لیے کہا گیا ہے ـــــ از دل خیزد بر دل ریزد۔

ایک صاحب ایک مرتبہ تبلیغی جلسہ سے واپس آئے تو مولانا نے فرمایا۔ کہو کچھ اپنی حالت پر افسوس بھی ہوا۔ انہوں نے کہا۔ "جو کچھ دیکھا اس کے بعد تو اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے بھی شرم آنے لگی ہے" اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کی زندگی ہی میں کام اس ترقی کو پہونچ گیا کہ نومبر ۱۹۴۱ء میں جب میوات میں پہلا بڑا تبلیغی جلسہ ہوا تو ۲۵ ہزار آدمی اس میں شریک ہوئے۔ ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو ۵۰ ــ ۵۰ میل سے پیدل چل کر وہاں پہونچے تھے۔ ایک میواتی سے جب پہلی بار آپ نے کہا کہ جاؤ تبلیغ کرو۔ تو وہ بولا۔ "تبلید کیا ہو ہے" مگر یہی لوگ جو تبلیغ کا صحیح تلفظ بھی نہیں جانتے تھے وہ ایسے مبلغ بنے کہ انہوں نے مبلّغوں کی ایک نئی قوم ملک میں پیدا کر دی۔ اگر کوئی اس وقت مبلّغوں کے ان قافلوں کو دیکھے جو بستی بستی اس طرح گھوم رہے ہیں کہ کاندھوں پر کمبل پڑے ہوئے ہیں۔ بغل میں سیپارے دبے ہوئے ہیں۔ چادر کے پلّو میں چنے یا چند روٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ زبانیں تسبیح اور ذکر میں مشغول ہیں۔ آنکھوں میں شب بیداری کے آثار، پیشانی پر سجدے کے نشانات، ہاتھ پاؤں سے جفاکشی اور مشقت نمایاں، تو دیکھنے والوں کو وہ منظر یاد آجاتا جب عرب کے مفلس اور غیر تعلیم یافتہ باشندے اسلام کی دولت کو پاکر سرشار تھے اور قرآن اور احکام دین کی تعلیم کے لیے چاروں طرف چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔

تبلیغ کی اندرونی طاقت

مولانا نے اپنی تبلیغ کے ذریعہ لوگوں کو وہ کیا چیز دی تھی جس نے اتنی بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ تھا آخرت کا خیال اور نصرت الٰہی کا یقین۔ مولانا نے اس حقیقت کو شدت سے لوگوں کے ذہن نشین کیا کہ اس کائنات کا ایک مالک ہے۔ اور اسی کے پاس لوٹ کر ہمیں جانا ہے۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس کی مرضی کے بغیر ہل نہیں سکتا جو کچھ ہوگا اسی کے کیے سے ہوگا۔ اس کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے ایک واقعہ پر غور کیجیے۔ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک میواتی

صحبت یافتہ سے ایک شخص نے پوچھا۔ "اپنی تبلیغی زندگی کا کوئی واقعہ بتائیے "۔

میواتی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنا شروع کیا "مولانا نے ایک مرتبہ تین آدمیوں کی ایک جماعت مراد آباد بھیجی۔ جس میں سے ایک میں تھا۔ مولانا نے چلتے وقت یہ مختصر سی ہدایت دی کہ اللہ کے نام پر روانہ ہو جاؤ۔ اور جب کوئی مشکل پڑے تو ایسا کرنا کہ بستی کے باہر جا کر تنہائیوں میں نماز پڑھنا اور دعا کرنا کہ خدایا ہماری مشکل حل کر دے۔ ہم لوگ بستی میں پہونچ کر ایک مسجد میں داخل ہوئے۔ مغرب کی نماز کے بعد اعلان کیا گیا "لوگ ٹھہر جائیں۔ کچھ دین کی باتیں ہوں گی "۔ مگر جب ہم سنتوں سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ ایک ایک شخص جا چکا ہے۔ اور مسجد میں ہم تین کے سوا کوئی موجود نہیں۔ اب ہم ٹھیر کر اگلی شام کا انتظار کرنے لگے۔ دوسرے دن پھر مغرب کی نماز کے بعد یہی اعلان کیا۔ مگر دوسرے دن بھی یہی قصہ پیش آیا کہ نماز کے بعد سارے لوگ مسجد سے اٹھ اٹھ کر چلے گئے۔ اب ہمیں مولانا کی نصیحت یاد آئی۔ رات گزار کر صبح کو ہم لوگ حسب ہدایت بستی کے باہر چلے گئے اور سارا دن دعا کرتے رہے۔ شام کو آکر پھر اسی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی اور جس طرح دو دن اعلان کر چکے تھے، اسی طرح آج بھی اعلان کیا —— "نماز سے فارغ ہو کر آپ لوگ ٹھہر جائیں کچھ دین کی باتیں ہوں گی "۔

اتنا کہہ کر میواتی رک گیا۔ وہ پوچھنے والے کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ کسی نہایت اہم واقعہ کا انکشاف کرنے جا رہا ہو۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے اپنی خاص زبان میں کہا:

" جیسے دھرتی نے سب کو پکڑ لیا، ایک بھی نہ اٹھا، حضرت! یہ کام تو بس یوں ہی چلے گا "۔

جن لوگوں کو یہ تجربہ ہوا، اس تجربے نے انہیں کتنی قیمتی چیز عطا کی۔ اس نے انہیں اس لازوال حقیقت کا رازداں بنایا کہ یہاں ایک ایسا خزانہ بھی پوشیدہ ہے جس کا مالک بننے کے لیے ٹوٹے ہوئے دل اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسی طاقت ہے جو زمین کو ہلا دے اور پہاڑوں کو کھسکا دے۔ یہ نہتوں کو عظیم ترین ہتھیاروں سے مسلح کرتا ہے، یہ بے علم افراد کو بڑے بڑے مدعیانِ علم سے مقابلہ کرنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔ یہ وہ فیض ہے جس کو پا کر گونگے بولنے لگتے ہیں، اندھے دیکھنے لگتے ہیں اور لنگڑے چلنے لگتے ہیں۔ یہ ہر تالے کی کنجی ہے اور ہر دروازے کو کھولنے والا ہے۔ اس کے ملنے سے وہ سروسامان ملتا ہے کہ انتہائی انتہائی بے سروسامانی کے باوجود آدمی زندگی کے تمام مراحل کو پار کرتا چلا جائے۔

اس طرح کے بے شمار تجربے ہیں جن سے تبلیغ کی تاریخ بھری ہوئی ہے اور اس نے تبلیغ کے افراد کو ایک ایسی ذہنی اور نفسیاتی طاقت دی ہے کہ وہ انتہائی مشکل حالات کے باوجود اقدام کرنے سے نہیں ہچکچاتے سخت ترین ماحول میں گھس کر کام کرنے سے ہراساں نہیں ہوتے۔ وہ دعا کو اپنے لیے عصائے موسیٰ سمجھتے ہیں۔

انہیں یقین ہے کہ یہ عصا انہیں کسی بھی مقام پر دھوکا نہیں دے سکتا۔

ہر شخص اور ہر قوم کو کسی ایسے سہارے کی ضرورت ہے جس کے اوپر وہ اپنے اقدام اور استحکام کے لیے بھروسہ کر سکے اور جس کے اوپر اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔ تمام لوگ ایسا سہارا فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس کے جس سرچشمے سے عام طور پر لوگ واقف ہیں وہ صرف مادی ساز و سامان ہے۔ لوگ صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ جدید ترین ٹکنالوجی کو استعمال کر کے بڑے بڑے کارخانے کھڑے کرو۔ بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کے ذریعہ سارے ملک کی دولت اکٹھا کر لو۔ بموں اور ہوائی جہازوں سے اپنی فوجی چھاؤنیوں کو بھر دو۔ جبری فوجی ٹریننگ کے ذریعہ سارے ملک کو عظیم فوج میں تبدیل کر دو۔ خلائی سائنس کے محیر العقول کارنامے دکھا کر دنیا کے اوپر اپنا سکہ جما دو، ریڈیو، ٹیلی ویژن، پریس، اور ان تمام چیزوں کے مالک بن جاؤ جن کو آج طاقت و قوت سمجھا جاتا ہے ۔

گویا جن لوگوں کے پاس اس قسم کے ساز و سامان فراہم کرنے کے حالات نہ ہوں، ان کے لیے اس دنیا میں کچھ نہیں ہے۔ مگر تبلیغی نظریہ آدمی کو طاقت کے ایسے خزانے سے آشنا کرتا ہے جس کے لیے ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف ایک ایسی چیز کی ضرورت ہے جو ہر آدمی کے پاس موجود رہتی ہے، خواہ وہ کسی حال میں ہو۔ اور وہ ہے آدمی کا دل۔ اگر آدمی اپنے دل کو خدا کے آگے ڈال دے تو ساری کائنات اس کے قدموں کے نیچے آجائے گی۔

یہ طاقت کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس کو اقتصادی امداد روک کر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ناکہ بندی کر کے اسے مسدود کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ ٹینکوں کا مارچ اور ہوائی جہازوں کی بمباری بھی اسے فنا نہیں کر سکتی۔ اور نہ اس قسم کی کوئی خبر اس کے لیے اندیشہ ناک ثابت ہو سکتی ہے کہ حریف نے زیادہ طاقتور قسم کا ہتھیار ایجاد کر لیا ہے۔

جو نظریہ آدمی کو اتنی بڑی طاقت دیتا ہو، جو نہتوں کو سب سے زیادہ طاقت ور فوج میں تبدیل کر دینے والا ہو، اس کی کشور کشائی اور جہانگیری کا کیا ٹھکانا۔ اور تبلیغی کارکنوں کے وہ حیرت انگیز واقعات جو مغرب سے لے کر مشرق تک پیش آرہے ہیں، ثابت کرتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اس سرچشمہ میں سے ایک حصہ عطا فرمایا ہے۔ مگر خدا کی یہ نعمت اپنی پوری شکل میں اس وقت ظاہر ہو گی جب پوری قوم اس راہ پر آجائے۔ مولانا الیاس صاحبؒ کو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ اگر پوری قوم اس راہ پر آجائے تو خدا کی نصرت ان کے اوپر اس آخری اور انتہائی شکل میں ظاہر ہو سکتی ہے جب ایک بے حیثیت قوم اٹھ کر پوری دنیا کو زیر و زبر کر دے۔ جب کسی تار کے بغیر ان کے امیر کی آواز مدینہ سے نہاوند کی پہاڑیوں تک سنائی

دے۔ جب سمندروں اور جنگلوں پر ان کا حکم چلنے لگے۔ جب قومیں ان کی باج گزار ہوں اور زمین میں ہر طرف ان کا جھنڈا لہرانے لگے۔ یہ سب ممکن ہے اور اس امکان کا سرا صرف اس واقعہ میں ہے کہ ہم "اللہ کو اپنائیں"۔

نصرت قرآن میں

یہاں "نصرت" کے بارے میں قرآن کا نظریہ بیان کرنا مناسب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت جو بندوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک وہ جس کو قرآن میں "حیات طیبہ" کہا گیا ہے اور دوسری وہ جس کے لیے استخلاف اور تمکین فی الارض کے الفاظ آئے ہیں۔ دونوں آیتیں حسب ذیل ہیں:

من عمل صالحا من ذکر او انثی وهو مومن فلنحیینه حیاة طیبة ولنجزینهم اجرهم باحسن ما کانوا یعملون (نحل - ۹۷)	جو نیک عمل کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو ہم اس کو حیات طیبہ کی زندگی دیں گے، اور ان کے عمل کا ان کو بہترین بدلہ دیں گے۔

دوسری آیت یہ ہے:

وعد الله الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم ولیمکنن لهم دینهم الذی ارتضیٰ لهم ولیبدلنهم من بعد خوفهم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً۔ نور - ۵۵	جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح کیا، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں اقتدار بخشے گا جس طرح پچھلوں کو اقتدار دیا تھا۔ اور ان کے لیے ان کے دین کو جما دے گا اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔

"حیاۃ طیبہ" سے مراد یہ ہے کہ شخصی طور پر ایک آدمی کو اچھی اور ستھری زندگی حاصل ہو۔ ایک مفسر کے الفاظ میں اس اچھی اور ستھری زندگی کے اجزاء مثال کے طور پر یہ ہیں ——— "دنیا میں حلال روزی قناعت، غنائے قلبی، سکون و طمانیت، ذکر اللہ کی لذت، حُبِ الٰہی کا مزہ، ادائے فرض عبودیت کی خوشی، کامیاب مستقبل کا تصور، تعلق مع اللہ کی حلاوت، وغیرہ"۔ یہ چیزیں جس کو ملتی ہیں اس کی زندگی تنگی اور فراخی ہر حال میں بہترین کیفیات سے مالا مال رہتی ہے۔

دوسری چیز استخلاف اور تمکین ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ نصرت ہے جو اجتماع اور معاشرہ کے اوپر نازل ہوتی ہے۔ ایک مفسر کے الفاظ میں:

> "یہ خطاب فرمایا حضرت نے وقت کے لوگوں کو۔ یعنی جو ان میں اعلیٰ درجے کے نیک اور رسول کے کامل متبع ہیں، رسول کے بعد ان کو زمین کی حکومت دے گا اور جو دین اسلام

خدا کو پسند ہے ان کے ہاتھوں سے دنیا میں اس کو قائم کرے گا۔ گویا جیسا کہ لفظ استخلاف میں اشارہ ہے، وہ لوگ محض دنیوی بادشاہوں کی طرح نہ ہوں گے۔ بلکہ پیغمبر کے جانشین ہوکر آسمانی بادشاہت کا اعلان کریں گے۔ اور دین حق کی بنیادیں جما دیں گے۔ اس وقت مسلمانوں کو کفار کا خوف مرعوب نہ کرے گا۔ وہ کامل امن و اطمینان کے ساتھ اپنے پروردگار کی عبادت میں مشغول رہیں گے۔ اور دنیا میں امن و امان کا دور دورہ ہوگا۔ ان مقبول و معزز بندوں کی ممتاز شان یہ ہوگی کہ وہ خالص خدائے واحد کی بندگی کریں گے جس میں ذرہ برابر شرک کی آمیزش نہ ہوگی۔ صرف ایک خدا کے غلام ہوں گے، اسی سے ڈریں گے، اسی سے امید رکھیں گے، اسی پر بھروسہ کریں گے۔ اسی کی رضا میں ان کا جینا اور مرنا ہوگا۔ کسی دوسری ہستی کا خوف و ہراس ان کے پاس نہ پھٹکے گا۔ نہ کسی دوسرے کی خوشی ناخوشی کی پروا رکھیں گے۔"

ان دونوں آیتوں میں جس شخصی اور اجتماعی نعمت کا ذکر ہے، ان کے دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے اور دونوں میں ان کے استحقاق کی ایک ہی مشترک بنیاد بتائی گئی ہے، اور وہ ہے — ایمان اور عمل صالح۔ گویا حیات طیبہ اور تمکین فی الارض کے حصول کا راز اللہ تعالیٰ کے حصول میں پوشیدہ ہے اگر ہم حقیقی معنوں میں مومن بن جائیں اور عمل صالح کی زندگی اختیار کریں تو وہ خدا جو مالک الملک ہے، جو حالات کو کنٹرول کرتا ہے اور واقعات عالم کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے، وہ ہمارے لیے ایسے اسباب و حالات پیدا کرے گا کہ ایک طرف ہم ذاتی طور پر دین کی حقیقت کو پالیں، اور دوسری طرف اگر ہمارا ایمان اور عمل صالح اجتماعی سطح پر پہونچ جائے تو خدا کی نصرت پورے اجتماعی دائرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور ہماری کوششیں ایسے موافق رخ اختیار کریں گی جن کے اجتماعی نتائج نکلنے لگیں۔

مولانا الیاس صاحبؒ کے نزدیک یہ نصرت کا تصور تبلیغ کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس سے مبلغ کو وہ قوت اور وہ سہارا حاصل ہوتا ہے کہ وہ ہر ماحول اور ہر قسم کے حالات میں دینی کام کا آغاز کرسکے اور ایک ناقابل شکست اعتماد کے ساتھ اپنے کام کو آخر تک جاری رکھے۔ یہ ایک طرف مبلغ کی قوت ہے، دوسری طرف وہ اس یقینی امید کا سرچشمہ بھی ہے کہ جس کے اوپر تبلیغ کی جارہی ہے اس کا دل بھی خدا ہی کی مٹھی میں ہے اور وہ اس کو زیر کرکے رہے گا۔

دل سے خطاب

اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال اپنے لاہور کے مکان میں آرام کرسی پر نیم دراز ہیں۔ حقہ

سامنے ہے اتنے میں ایک شخص داخل ہوتا ہے۔ علیک سلیک اور رسمی مزاج پرسی کے بعد گفتگو شروع ہوتی ہے۔

"آپ ایک کتاب لکھیے" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

"کیسی کتاب" نو وارد نے پوچھا۔

تحقیقات کرنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے قصبات اور دیہات میں ہزارہا غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان از خود مسلمان ہونے والوں سے ملے اور ان سے قبولِ اسلام کے اسباب دریافت کرکے ایک کتاب میں جمع کر دے تو اس سے تبلیغ اسلام کے مقصد کو بے حد تقویت حاصل ہوگی۔

"کیا صداقت اسلام کے متعلق پہلے دلائل ناکافی ہیں؟"

"بہت کافی ہیں۔ مگر ایسا کرنے سے کچھ ایسے عجیب اور جدید دلائل آپ کو ملیں گے کہ دنیا حیرت زدہ رہ جائے گی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ دل اور دماغ کے کام کرنے کے طریقوں میں بہت فرق ہے۔ دماغ اکثر اوقات ہزارہا مضبوط دلائل کو مسترد کر دیتا ہے اور ان کی کچھ بھی پروا نہیں کرتا۔ لیکن دل اس کے برعکس بعض اوقات کمزور سے کمزور چیزوں سے اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ صرف ایک ہی جھٹکے میں زندگی کا سارا نقشہ بدل جاتا ہے۔ قبولِ اسلام کا تعلق جس قدر دل سے ہے، دماغ سے نہیں۔ اصل بات جو مبلغ کو معلوم ہونا چاہیے، یہ ہے کہ وہ کون کون سے نشتر ہیں جن سے دل متاثر ہوا کرتے ہیں۔ کفار اور مشرکین کے انقلاب حیات کی ہزارہا مثالیں تاریخ اسلام میں موجود ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنے حالات کے تحت ایک خیال یا ایک مذہب پر چٹان کی طرح قائم ہوتا ہے۔ ناگہاں غیب سے اس کے دل پر ایک نشتر چلتا ہے اور چشم زدن میں اس کی زندگی کی تمام گزشتہ تاریخ بدل جاتی ہے۔ صداقت اسلام کے عقلی دلائل تو آپ کے پاس بہت ہیں۔ مگر قلبی دلائل کم ہیں۔ اگر آپ نومسلموں کے پاس جائیں تو وہ بتائیں گے کہ اسلام کی وہ کون سی بے ساختہ ادا تھی جو ان کے دل کو بھا گئی۔ اگر ان کے بیانات ایک کتاب میں جمع کر دیئے جائیں تو مجھے یقین ہے کہ انقلاب حیات کی ایک بالکل نئی دنیا مبلغین کے سامنے آجائے گی اور انہیں اشاعت اسلام کے لیے ایسے نئے دلائل یا جدید ہتھیار مل جائیں گے جن سے اسلام کا موجودہ کتب خانہ خالی ہے۔"

اس کے بعد مثال کے طور پر چند واقعات بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر اقبال نے مزید کہا:

"قبول اسلام میں اصل چیز دل ہے۔ جب دل ایک تبدیلی پر رضامند ہو جاتا ہے اور کسی بات پر قرار پکڑ لیتا ہے تو پھر باقی تمام جسم اس کے سوا کچھ نہیں کرتا کہ وہ اس تبدیلی کی تائید کے لیے وقف ہو جائے۔

ہمیں اسلام کے قدیم وجدید مبلغوں میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے۔ قدیم مبلغوں کا وار غیر مسلموں کے دلوں پر ہوتا تھا۔ وہ اپنی للّٰہیت، بے نفسی، خوش خلقی اور احسان ومروت کی جادو اثر اداؤں سے دلوں کو گرویدہ کرتے تھے۔ اور اس طرح ہزار ہا لوگ از خود بغیر کسی بحث و تکرار کے ان کے رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ مگر جدید مبلغوں کا سارا زور دماغ کی تبدیلی پر صرف ہوتا ہے۔ وہ صداقت اسلام پر ایک دلیل دیتے ہیں۔ مقابلہ میں دوسری حجت غیر مسلم پیش کر دیتے ہیں۔ اس پر بحث و تکرار شروع ہو جاتی ہے۔ مسلمان اپنی بات پر اڑ جاتا ہے۔ غیر مسلم اپنے قول پر تن جاتا ہے۔ اس سے ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہدایت ختم ہو جاتی ہے۔"

"مبلّغین اسلام کو دلوں کے متاثر کرنے کے لیے نکلنا چاہیئے یا دماغوں کے؟" ڈاکٹر اقبال نے مزید تفصیل کرتے ہوئے کہا۔" اس کے فیصلے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم فطرت کی روش کی پیروی کریں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ فطرت اپنی فتوحات حاصل کرنے کے لیے اپنا تعلق ہمیشہ دلوں سے جوڑتی ہے۔ فطرت کھانے میں لذت پیدا کرتی ہے اور آپ اسے بے اختیار کھا جاتے ہیں۔ اس وقت ایک بھی شخص دماغ سے یہ نہیں پوچھتا۔ کیا یہ کھانا طبّی لحاظ سے مفید ہوگا۔ آپ کہیں جا رہے ہوتے ہیں کہ ناگہاں پھولوں کی ایک خوشنما زمین اور لب جو کا ایک حسین نظارہ سامنے آجاتا ہے، آپ وہاں بے اختیار بیٹھ جاتے ہیں، وہیں ٹھنڈی ہوا کا ایک دلنواز جھونکا آتا ہے اور آپ کو میٹھی نیند سلا دیتا ہے۔ اس وقت کوئی بھی شخص دماغ سے یہ نہیں پوچھتا کہ مجھے سونا چاہیئے یا نہیں۔ مختصر یہ کہ فطرت ہر کام میں اسی طرح دلوں کو گرویدہ کرکے مطلب نکالتی ہے۔ وہ دماغوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتی۔ اسلام چونکہ سربسر نور فطرت ہے۔ اس واسطے مبلّغین اسلام کو چاہیئے کہ اخلاق ومحبت کی گیرائیوں سے دلوں کو اس طرح شکار کریں کہ ان میں سرکشی اور انکار کی سکت ہی باقی نہ رہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مبلّغ اسلام، اسلامی کیرکٹر کی عظمت کے مالک ہوں۔ تاکہ سرکش سے سرکش آدمی بھی ان کے سامنے اپنی گردن جھکا دیں۔ باقی رہے دماغی مباحث اور عقلی تکرار، تو اس سے نہ تو دل مطمئن ہو سکتے ہیں نہ منقلب ہو سکتے ہیں۔ اور نہ فطرت رام ہو سکتی ہے۔"

شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مولانا الیاس صاحبؒ کی ذات اور ان کی پھیلائی ہوئی تبلیغ، کم از کم مسلمانوں کے اندر کام کی حد تک، ڈاکٹر اقبال کے اسی خواب کی تعبیر ہے۔ مولانا کی پوری زندگی اور تبلیغی تحریک کی پوری تاریخ اس طریق تبلیغ کی مثالوں سے بھری پڑی ہے اور اس کے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ یہاں واقعات کو جمع کرنا مقصود نہیں ہے۔ میں اصل مدعا کو واضح کرنے کے لیے صرف ایک مثال نقل کروں گا۔

ایک عربی مدرسہ کے کچھ طلبہ مولانا الیاس صاحب کے یہاں حاضری کے لیے نظام الدین گئے۔ اس

میں ایک نہایت شریر طالب علم بھی تھا جس کو اس کے ساتھیوں نے کہہ سن کر وہاں جانے کے لیے راضی کیا تھا۔ جانے کو تو وہ طالب علم چلا گیا۔ مگر جب رات ہوئی اور لوگ سو گئے تو وہ کچھ ساتھیوں کو لے کر سینما دیکھنے کے لیے دہلی روانہ ہو گیا۔ ان لوگوں کو نظام الدین سے دہلی جانے کے لیے تو بس مل گئی مگر دوسرا شو دیکھ کر جب وہ فارغ ہوئے تو واپسی کے لیے کوئی بس نہیں تھی۔ مجبوراً رات کو یہ لوگ دہلی ہی میں رہ گئے۔

یہاں نظام الدین میں صبح کی نماز کے بعد حسب معمول جب مولانا الیاس صاحب وعظ کے لیے ممبر پر بیٹھے تو انہوں نے کہا ــــ مدرسہ کے لوگ جو کل شام کو آئے ہیں وہ سب قریب آجائیں۔" اس وقت وہاں صرف دو طالب علم تھے۔ مولانا نے کہا خیر انتظار کیجیے۔ وہ لوگ شاید ضروریات کے لیے کہیں گئے ہوں واپس آجائیں گے تو گفتگو شروع ہو گی۔ مگر وہ لوگ کافی دیر بعد نظام الدین پہونچے۔ اب ان کا معاملہ مشتبہ ہو گیا نیز بعض ذریعوں سے بھی معلوم ہو گیا کہ وہ لوگ سینما دیکھنے کے لیے دہلی گئے ہوئے تھے۔

اس وقت مذکورہ مدرسہ کے ناظم صاحب بھی نظام الدین میں موجود تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ طلبہ نے یہاں آکر اس قسم کی "بے ہودگی" کی ہے تو وہ سخت برہم ہوئے۔ مذکورہ طالب علم کے بارے میں پہلے ہی سے ان کی رائے خراب تھی۔ کیونکہ وہ مدرسہ میں بُری عادتوں کی وجہ سے کافی بدنام تھا۔ وہ اس قدر ڈھیٹ ہو چکا تھا کہ ایک بار مدرسہ کی انجمن کے لیے چندہ وصول کرنے گیا اور اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ۲۰ ہزار روپے چندہ وصول کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر روپیہ ملا تو اس نے پورے روپیہ کی ناولیں خرید ڈالیں اور ان کے پارسل انجمن کے کتب خانہ کے نام روانہ کر دیئے۔ یہاں جب ذمہ داران مدرسہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے بندھے ہوئے بنڈل بازار میں بھجوا دیئے اور انہیں ردی میں فروخت کرا دیا۔

رات کے واقعہ کے بعد یہ سارے واقعات ناظم صاحب کے ذہن میں آگئے۔ اس سے پہلے اس کو سمجھانے بجھانے کی ساری کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ انہوں نے سوچا کہ اب یہ لڑکا ناقابل اصلاح ہو چکا ہے اور مدرسہ کو مزید بدنامی سے بچانے کے لیے اس کا فوراً اخراج ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے مدرسہ کے صدر مدرس کو خط لکھا کہ فلاں طالب علم نے یہاں آکر ہمارے مدرسہ کو سخت بدنام کیا ہے۔ ان کے نام فوراً مدرسہ سے خارج کر دیئے جائیں۔

ادھر جو صاحب اس طالب علم کو کہہ سن کر نظام الدین بلا گئے تھے وہ پریشان ہوئے۔ ان کی سمجھ میں آیا کہ مولانا الیاس صاحب سے یہ تمام بات کہہ دی جائے۔ چنانچہ تنہائی میں حاضر ہو کر انہوں نے مولانا کو پورا واقعہ بتا دیا۔ مولانا نے کہا ٹھیک ہے۔ فکر نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ سب درست فرما دے گا۔ اس کے بعد عصر کی نماز پڑھ کر جب شام کی مجلس ہوئی تو مولانا نے قلم کاغذ اور لفافہ منگوایا۔ اور

مدرسہ کے ناظم صاحب کو قریب بلاکر کہاکہ آپ کے مدرسہ کے صدر مدرس صاحب کے نام ایک خط میں املا کراتا ہوں اس کو لکھیے۔ اس کے بعد انہیں کے ہاتھ سے اس مضمون کا خط لکھوایا کہ "آپ کے مدرسہ سے کچھ لڑکے یہاں آئے۔ میں ان سے بہت خوش ہوں۔ وہ یہاں سے بہت کچھ لے کر جارہے ہیں۔ میری خصوصی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ اور آپ سے گزارش ہے کہ آپ ان سے اعزاز واکرام کا معاملہ فرمائیں۔ اس کے بعد ناظم صاحب سے کہاکہ آپ بھی اس پر اپنی تصدیق لکھئے۔ ناظم صاحب نے خاموشی سے تصدیق لکھ دی۔ اور اس کے بعد مولانا نے اپنے ہاتھ سے وہ خط لفافہ میں بند کر کے اپنے خاص آدمی کو دیا کہ جاؤ ڈاک میں ڈال آؤ۔

اس واقعہ کا اتنا زبردست اثر ہوا کہ مدرسہ کا سب سے زیادہ شریر طالب علم وہاں کا سب سے زیادہ شریف اور سنجیدہ طالب علم بن گیا۔ اور تبلیغ کا باقاعدہ کارکن ہو گیا۔ لوگ اس سے پوچھتے کہ تمہاری زندگی میں اتنا زبردست تغیر کیسے ہو گیا تو وہ صرف ایک جملہ کہتا ــــ "مولانا الیاس نے مجھے چھین لیا"۔ جس شخصیت کو مدرسہ کا علم اور ناظم کے اختیارات قابو میں نہیں لا سکے تھے۔ اس کو اخلاق کی طاقت نے مسخر کر لیا۔

اس طرح کے واقعات سے مولانا الیاس صاحب کی زندگی اور تبلیغی تحریک کی تاریخ بھری ہوئی ہے دعا اور محبت اخلاق اور خیر خواہی نے ہزاروں قلوب کو جیتنے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ تبلیغ کی زبان میں ایک عجیب تسخیری شان پیدا ہو گئی ہے۔ آپ تبلیغ کے کسی بھی جلسے میں شریک ہو کر اس کے مقررین کی تقریریں سنئے۔ آپ محسوس کریں گے کہ یہاں ایک ایسی زبان استعمال ہو رہی ہے جو ساری تحریکوں سے جدا ہے۔ اس زبان کے اجزا ہیں ــــ سادگی، گھلاوٹ حقیقت رسی، فطرت سے قریب تر استدلال، روح کو مانوس کرنے والا انداز، دل کو چھیدنے والے کلمات، اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تبلیغ کے کارکن، ڈاکٹر اقبال کے الفاظ میں، دل کی راہ سے چلتے ہیں۔ اس لیے خواہ ان کے یہاں عقلی ساز و سامان کم ہو مگر دل والی باتوں کی بہتات ہے اور یہ اس کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

پروگرام

مولانا الیاس صاحب نے اپنے کام کا جو ابتدائی خاکہ بنایا تھا، اس کو وہ چھ نکات کی شکل میں بیان کرتے تھے:

۱۔ کلمۂ اسلام کو دلوں میں بٹھانا۔

۲۔ نماز کو اس کی حقیقی شکل میں قائم کرنا۔
۳۔ دین کا علم سیکھنا۔
۴۔ اکرام مسلم۔
۵۔ تفریغ وقت۔ یعنی دنیوی مشاغل سے اپنے وقت کو فارغ کرکے جماعت کی شکل میں باہر نکلنا
۶۔ تصحیح نیت اور اخلاص و احتساب۔

ان چھ نکات کو اگر مزید گھٹایا جائے تو اس کو تین پر تقسیم کیا جا سکتا ہے ــــ کلمۂ توحید، نماز اور تفریغ وقت بقیہ تینوں اجزاء دراصل انہیں چیزوں کے تقاضے ہیں جو ان کو صحیح طور پر اختیار کرنے کے بعد لازماً پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو الگ سے بیان کرنا محض وضاحت کے لیے ہے نہ کہ تعین کے لیے۔

مولانا الیاس صاحب کے اس دعوتی پروگرام کی تشریح مختلف الفاظ میں بیان کی جا سکتی ہے۔ خود مولانا اس کو "حضورؐ کے طریقہ کو زندہ کرنے کی کوشش" کا نام دینا پسند کرتے تھے اور اسی قسم کے الفاظ اور اصطلاحات میں اس کی وضاحت فرماتے تھے۔ بلاشبہ یہ الفاظ آپ کی دعوت کو اس کی اصل حیثیت میں ظاہر کرنے کے لیے موزوں ترین بلکہ محبوب ترین ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو جدید انداز میں سوچتے ہیں اور جنہیں کسی بات کی صداقت کا اسی وقت پورا اطمینان ہوتا ہے جب وہ اس کی تعبیر نفسیاتی، عمرانی یا فلسفیانہ الفاظ میں سن لیں، ان کے ذوق کی رعایت سے بھی اس پروگرام کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

مولانا الیاس صاحب کی دعوت میں کلمۂ توحید کو اولین اور بنیادی حیثیت حاصل ہے ــــ کلمۂ توحید کیا ہے۔ اس بات کا یقین کہ خدا ہی اس کائنات کا مرجع و مولیٰ ہے اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ شخص ہیں جن کے ذریعہ مکمل صداقت کا ظہور ہوا ہے۔ ایک شخص جب لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہتا ہے تو گویا وہ اپنی اس اندرونی کیفیت کا اظہار کرتا ہے کہ اس نے اس یقین کو اپنے دل میں جگہ دی ہے۔ اور یہ زندگی کے اس طریقہ پر آنے کا اعلان کر رہا ہے جو ایک طرف اس یقین کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے کہ خدا ہی حقیقۃً وہ وجود ہے جو انسان کے جذبات اور امنگوں کا مرکز ہے اور وہی وہ ہستی ہے جس پر اس کو سارے معاملات میں بھروسہ اور اعتماد کرنا چاہیے اور دوسری طرف یہ اعلان گویا اس بات کا اظہار ہے کہ آدمی اس احساس سے سرشار ہے کہ وہ زندگی کا راستہ پا چکا ہے اور اسے معلوم ہو چکا ہے کہ سچائی کا سرچشمہ کیا ہے جس کی رہنمائی میں اسے اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے۔

یہ یقین و اعتماد اور یہ شرح صدر ہی دراصل وہ چیز ہے جو سارے انقلابات کی بنیاد ہے۔ دنیا

کے کسی بھی انقلاب کی تاریخ پڑھ لیجئے۔ آپ کو ملے گا کہ اسی قسم کا احساس ـــــ خواہ وہ باعتبار حقیقت صحیح ہو یا غلط ـــــ کچھ لوگوں میں پیدا ہو گیا تھا اور وہی بالآخر تحریک اور انقلاب کا سبب بنا۔ فرانس کا انقلاب، کمیونزم کی کامیابیاں اور مختلف ملکوں میں قومی آزادی کی جدوجہد دراصل اسی قسم کے احساس کی بنیاد پر شروع ہوئی اور اسی کی بنیاد پر جیتی گئی۔ ابتداءً ان میں سے کسی تحریک کے پاس نہ تو ہتھیار تھے نہ مال و دولت کی کثرت، حتیٰ کہ آئندہ بننے والے نظام کا کوئی تفصیلی نقشہ بھی نہیں تھا۔ ان کا اوّل و آخر سرمایہ بس ایک تخیل تھا جو ان کے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا۔ اور وہ یہ کہ ان پر سیاسی، معاشی یا قومی "سچائی" کا انکشاف ہوا ہے۔ اس احساس نے ان کے دل و دماغ میں آگ لگا دی، ان کی قوتوں کو مجتمع کیا۔ انہیں مستقبل سے بے پروا کر کے وقت کے خلاف کھڑا کر دیا۔ اور انہیں ایک ایسی مجنونانہ جدوجہد میں لگا دیا جس کا آخری انجام صرف کامیابی ہو سکتا تھا۔

یہ اس یقین کا انجام تھا جو صرف جزئی نوعیت کا تھا اور جس کو ہم صحیح بھی نہیں سمجھتے۔ پھر وہ یقین جو کلّی صداقت کی بنیاد پر پیدا ہو اور جو فی الواقع صداقت ہو نہ کہ محض غلط فہمی سے صداقت سمجھ لیا گیا ہو، ایسی صداقت اگر دلوں میں اتر جائے اور ایسے دین کے لیے اگر جنون پیدا ہو جائے تو اس کا کیا انجام ہوگا۔ دوسری تحریکوں نے اگر کسی جغرافی خطہ یا زندگی کے کسی گوشہ کے لیے ذہن کو متحرک کیا ہے تو یہ عقیدہ سارے کرۂ ارض کے لیے انسان کو بے تاب کر دینے والا ہے۔ دوسری تحریکوں کے افراد اگر ملک و قوم کے نام پر توپوں کے دہانے کے آگے کھڑے ہو گئے تو وہ تحریک جس کے افراد مالک کائنات کے اعتماد پر اٹھے ہوں ان کے سیلِ رواں کو کون روک سکتا ہے۔ دوسری تحریک کے افراد اگر اپنے خود ساختہ تخیلات کی برتری سے لوگوں کو مرعوب کر سکتے تھے تو عالم کل اور خالق فطرت کے دیے ہوئے تصورات میں جہان گیری کی کیا کچھ طاقت ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا الیاس صاحبؒ امت کو جو کلمہ دینا چاہتے تھے وہی دین کی اصل بنیاد ہے۔ وہ اس زمین کی عظیم ترین طاقت ہے۔ اس بنا پر اس تحریک کو کلمہ کی تحریک کہا جا سکتا ہے۔ مگر ایسا کہنے والوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہر تحریک جو بھی دنیا میں اٹھی ہے وہ ابتداءً کلمہ ہی کی تحریک تھی خواہ وہ انقلابی تحریک ہو یا غیر انقلابی تحریک۔ اور خواہ اس کا کلمہ سیاسی کلمہ ہو یا معاشی کلمہ یا قومی کلمہ۔ پھر دینی کلمہ کی بنیاد پر اگر کوئی تحریک اٹھے تو اس کو محدود یا ناقص کس بنا پر کہا جا سکتا ہے، جب کہ دینی کلمہ سارے کلمات کا جامع ہے۔

مولانا کی دعوت کا دوسرا جزء نماز ہے۔ عام طور پر لوگ نماز کی حقیقت اور اہمیت کو نہیں

جانتے اس لیے وہ اس کی واقعی عظمت کو نہیں سمجھ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کلمہ کو ذہنی طور پر بنیادی حیثیت حاصل ہے، اسی طرح نماز کا انسان کی عملی زندگی میں بنیادی مقام ہے۔ نماز اپنی اصلی اور اندرونی حقیقت کے اعتبار سے خدا کی طرف متوجہ ہونے اور اس سے حیاتی ربط قائم کرنے کا نام ہے۔ نماز بندے کو اپنے رب سے اس طرح جوڑتی ہے کہ وہ گویا کہ اسے دیکھنے لگتا ہے اور اس سے اس کی سرگوشیاں جاری ہو جاتی ہیں۔ نماز وہ مقام ہے جہاں خدا اپنے بندوں سے ملاقات کرتا ہے۔ جب آدمی نماز کو اس کے سارے ارکان کے ساتھ ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے اور دل و دماغ کی پوری یکسوئی کے ساتھ اس میں مشغول ہوتا ہے تو وہ ایک اور ہی دنیا میں پہونچ جاتا ہے۔ اس کی روح ایک ایسے تجربے سے دوچار ہوتی ہے جہاں عبدیت اور معبودیت کی حدیں ملنے لگتی ہیں۔ بندگی، خدائی کے جلوؤں میں نہا اٹھتی ہے۔ یہ تجربہ انسان کی شخصیت کو ایک نئی جلا دیتا ہے اور اس کو ایسی عجیب و غریب نعمتیں عطا کرتا ہے جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن میں نماز کی حقیقت کی مکمل تفصیل ہے۔ یہاں میں مختصراً چند کا ذکر کرتا ہوں۔

ان میں سے ایک چیز وہ ہے جس کو قرآن میں "خشوع" کہا گیا ہے۔ خشوع کے معنی ہیں فروتنی عاجزی اور جھکاؤ۔ نماز کی شکل میں آدمی جب خدا کے سامنے حاضر ہوتا ہے اور اس کو یاد کرتا ہے تو خدا کی خدائی اور اپنی بندگی کا احساس اس پر اس طرح طاری ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک قسم کی عاجزی اور فروتنی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسا وجود سمجھنے لگتا ہے جو خدا کے سامنے ہمیشہ جھکا رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر سے کبر نکل جاتا ہے جو اکثر برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ کمزور کے اوپر طاقت ور کا ظلم، ماتحت کے اوپر افسر کا برا سلوک، قانونی طور پر بہتر پوزیشن والے کا قانونی طور پر کمتر پوزیشن والے کو دبانا، صاحب اثر شخص کا بے اثر اشخاص کو خاطر میں نہ لانا، صاحب مال کا بے مال لوگوں سے بے اعتنائی برتنا، اکثریت کے افراد کا اقلیت کے افراد کو لوٹنا، غرض جب بھی کوئی زور آور آدمی بے زور افراد کو تختۂ مشق بناتا ہے تو ایسی تمام صورتوں میں ہمیشہ کبر ہی اس کی خاص وجہ ہوتی ہے۔ اگر کسی معاشرے کے افراد میں کبر کا خاتمہ ہو جائے تو بے شمار برائیوں کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔

نماز کا دوسرا فائدہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ـــــ "وہ برائیوں اور بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے"۔ نماز میں آدمی اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے، وہ اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ خدا کا تابعدار بن کر زندگی گزارے گا، وہ اس آنے والے دن کو یاد کرتا ہے جب اس کی زندگی

کا حساب ہوگا اور عذاب وثواب کی ترازو قائم کی جائے گی۔ یہ سب باتیں اگر سچے دل سے ہوں تو زندگی کو بدل دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔

نماز کا ایک اور اہم ترین پہلو وہ ہے جس کو "ذکر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے خدا کی یاد سے دل کا معمور رہنا اس طرح نماز گویا اس بات کے لیے آدمی کو تیار کرتی ہے کہ اس کے دل ودماغ ان صحیح ترین خیالات سے بھرے رہیں جو حقیقۃً کسی کے ذہن وقلب میں ہونے چاہئیں۔ یہ فکر اور جذبات کی اعلیٰ ترین تربیت ہے۔

یہ نماز کے وہ نتائج ہیں جو نفسیاتی اور سماجی پہلو رکھتے ہیں اور جن کے اثرات معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ نماز کی اصلی حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ خدا کے آگے اپنا سر رکھ دے اور اس کا دل کہہ رہا ہو ——— "خدایا میں تیرا ہوگیا۔ تو بھی میرا ہو جا۔"

مولانا کی دعوت کا تیسرا جز "تفریغ وقت" ہے۔ اس کام کے لیے "چلّہ" کا لفظ سن کر بعض لوگوں کو توحش ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ صرف ایک اعتباری مدت ہے جو تربیت اور دعوت کی اس دوگونہ مہم کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ تفریغ وقت دراصل اس حقیقت کا مظہر ہے کہ آدمی اپنے عقیدے میں اتنا بے تاب ہو چکا ہے کہ اس کے لیے اپنی مصروفیتوں کو چھوڑ کر گھر سے باہر نکل پڑا ہے۔ ایمان کے ساتھ تبلیغ کا سودا بھی اس کے سر میں سما گیا ہے، وہ اپنے درد کو سارے عالم کا درد بنا دینا چاہتا ہے۔ یہ کیفیت جب عملی شکل اختیار کرتی ہے تو تبلیغ کی اصطلاح میں اسی کا دوسرا نام وقت فارغ کرنا یا اس کی ایک مقررہ مدت کا نام چلّہ ہے۔

مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے گشت اور تبلیغی سفر کے طریقے پر جو اس قدر زور دیا اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے اندر تبلیغی فائدوں کے علاوہ بہت سے تعلیمی تربیتی اور اصلاحی فائدے بھی چھپے ہوئے ہیں۔ آدمی جب تبلیغ کی راہ میں دور دور کے سفر پر نکلتا ہے تو وہ دین سیکھتا ہے اپنی اخلاقی اصلاح کرتا ہے، لوگوں کی حالت دیکھ کر اپنے اندر دینی کام کی اہمیت کا احساس پیدا کرتا ہے قربانیاں اور مشقتیں اس کے اندر وہ سوز اور تڑپ پیدا کرتی ہیں جس کے بعد ایک طرف وہ دین داری کی حقیقی لذت سے آشنا ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کی زبان سے نکلے ہوئے تبلیغی کلمات میں جان پڑ جاتی ہے۔

لوگوں کو باہر نکالنا مولانا الیاس صاحبؒ کے دینی طریق کار کی جان ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے یہ موقع ملتا ہے کہ لوگوں کو ان کے ماحول سے نکال کر ایک دینی ماحول میں پہونچایا جائے اور اس کے

بعد ان کے اوپر تبلیغ کی جائے تاکہ وہ خالی الذہن ہو کر دین کی باتیں سنیں اور مختلف ماحول میں جاکر اس کا اثر زائل کرنے کے بجائے مسلسل اس سے اثر لیتے رہیں۔ یہ طریقہ عملی طور پر کافی مفید ثابت ہوا ہے اور اس کے ایسے نتائج نکلے ہیں کہ وہ لوگ جنہوں نے قریب سے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

تبلیغ کے لیے نکلنا، حدیث کے الفاظ میں، اپنے قدموں کو دین کی راہ میں گرد آلود کرنا ہے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ جو قدم دین کی راہ میں گرد آلود ہوں، ان کو دوزخ کی آگ کبھی نہ چھوئے گی۔ سرکس میں بعض آدمی یہ کرتب دکھاتے ہیں کہ وہ آگ کے الاؤ میں جسم کو ڈال دیتے ہیں اور ان پر آگ کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ یہ لوگ اپنے جسم پر خاص طرح کی مالش کر لیتے ہیں۔ اس مالش کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ آگ انہیں چھو نہیں سکتی۔ اسی طرح دین کی راہ کی گرد وہ چیز ہے جو دوزخ کی آگ کو بے اثر کر دینے والی ہے۔ جس کے اوپر یہ گرد پڑ گئی وہ گویا دوزخ کی آگ سے محفوظ ہو گیا۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مولانا الیاس صاحب یا ان کے پیرووں کے نزدیک تبلیغ کا گشت بذات خود وہ چیز ہے جس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس سے مراد کسی خاص گروہ کا گشت نہیں بلکہ دین کا گشت ہے۔ کسی کا گشت اسی وقت اس حدیث کا مصداق بنے گا جب کہ وہ حقیقۃً دین کا گشت ہو، اور جتنا زیادہ وہ دین کے لیے ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کا مصداق ہوگا اور دین سے اس کا تعلق جتنا کم ہوگا اتنا ہی اس کا مصداق ہونا مشتبہ ہوتا چلا جائے گا۔ کسی خاص گروہ سے نسبت اس کو حدیث کا مصداق نہیں بنا سکتی۔

مولانا الیاس صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا:

> "ہمارے طریق کار میں دین کے واسطے جماعتوں کی شکل میں گھروں سے دور نکلنے کو بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس کا خاص فائدہ یہ ہے کہ آدمی اس کے ذریعہ اپنے دائمی اور جامد ماحول سے نکل کر ایک نئے صالح اور متحرک ماحول میں آجاتا ہے۔ جس میں اس کے دینی جذبات کے نشو ونما کا بہت کچھ سامان ہوتا ہے۔ نیز اس سفر و ہجرت کی وجہ سے جو طرح طرح کی تکلیفیں مشقتیں پیش آتی ہیں اور در بدر پھرنے میں جو ذلتیں اللہ کے لئے برداشت کرنی ہوتی ہیں ان کی وجہ سے اللہ کی رحمت خاص طور سے متوجہ ہو جاتی ہے۔"

وسیع تصور

مولانا الیاس صاحب نے اپنے زمانہ میں تبلیغ کا کام جس ڈھنگ سے چلایا تھا، اس کے متعلق

مولانا فرماتے تھے کہ ــــ " یہ تبلیغ کی الف ب ہے " اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ الف ب کوئی اور چیز ہوتی ہے اور د ۔ ہ ۔ ی کوئی دوسری چیز۔ حقیقت یہ ہے کہ جو الف ۔ ب ہے وہی د ۔ ہ ۔ ی بھی ہے ۔ مگر جن لوگوں کی نگاہیں ظواہر پر ہوتی ہیں اور جو لوگ حقائق کا ان کی گہرائیوں کے ساتھ مشاہدہ نہیں کر سکتے ۔ ان کو بتانا پڑتا ہے کہ قطرہ کس طرح پھیل کر بحر بیکراں بنتا ہے ۔ قطرہ ہی کا دوسرا نام بحر بیکراں بھی ہے ۔ مگر عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قطرہ کوئی دوسری چیز ہے اور بحر بے کراں کوئی اور چیز۔

مولانا الیاس صاحب کے اس قول کو اس مثال کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے جیسے کوئی ڈرائیور اسٹیم تیار کر رہا ہو ۔ اور وہ کہے کہ یہ تو میرے کام کی الف بے ہے ۔ اسٹیم تیار کرنا ایک لحاظ سے کام کی الف ہے اور ایک لحاظ سے وہی سارا کام ہے ۔ کیونکہ اسٹیم کے بغیر نہ انجن چل سکتا ہے اور نہ گاڑی حرکت میں آسکتی ہے ۔ صرف یہی نہیں کہ اسٹیم کے بغیر کوئی انجن اپنی منزل پر نہیں پہونچ سکتا بلکہ اس کے بغیر دو قدم چلنا بھی اس کے لیے ناممکن ہے ۔

کام کے دو طریقے ہیں ۔ ایک یہ کہ پہلے ہی دن از اوّل تا آخر کام کا پورا خاکہ بنا لیا جائے ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس اصل بنیاد کو پکڑ لیا جائے جو دوسرے تمام اجزا کے لیے اساس کی حیثیت رکھتی ہے ۔ پہلا طریقہ پارلیمنٹ کی قانون سازی کا ہے اور دوسرا تحریک کا ۔ پارلیمنٹ کا اصول اگر تحریک کے لیے اختیار کیا جائے تو اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کے ساتھ اسی اصول کے تحت معاملہ کیا کہ آغاز نبوت میں دین کی صرف بنیادی باتوں کی تعلیم دی گئی اور لمبی مدت تک اسی پر سارا زور دیا جاتا رہا ۔ اس کے بعد جیسے جیسے حالات آگے بڑھتے گئے ، بقیہ چیزیں نازل کی جاتی رہیں ۔

اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اصل اساس مضبوط ہو جاتی ہے ۔ اور اساس کی مضبوطی کے بغیر کوئی بھی عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی ۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلامی عقیدہ کی رو سے ہر کام کی توفیق خدا ہی سے ملتی ہے ۔ ذاتی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی ، ان پر عمل کرنے میں آدمی اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب اس کے ساتھ خدا کی توفیق بھی شامل حال ہو جائے ۔

مولانا الیاس صاحب نے ایک مرتبہ اس سوال پر کلام کرتے ہوئے کہ " مسلمانوں کو حکومت واقتدار کیوں نہیں بخشا جاتا " فرمایا :

> اللہ کے احکام اور اوامر ونواہی کی حفاظت و رعایت جو تم اپنی ذات اور اپنی منزلی زندگی میں نہیں کر رہے ہو (جس پر تمہیں اختیار حاصل ہے اور کوئی مجبوری نہیں ہے)

تو دنیا کا نظم و نسق کیسے تمہارے حوالے کر دیا جائے۔ ایمان والوں کو حکومت ارضی دینے سے تو منشاء الٰہی یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی مرضیات اور اس کے احکام کو دنیا میں نافذ کریں تو تم جب اپنے حدود اختیار میں آج یہ نہیں کر رہے ہو تو دنیا کی حکومت تمہارے سپرد کر کے کل کے لیے تم سے اس کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔"

تبلیغ بذریعہ قلم

ایک نیاز مند سے (جن کو مولانا کے تبلیغی کام سے بھی تعلق تھا اور اس کے علاوہ تحریر و تصنیف ان کا خاص مشغلہ تھا) ایک دن مولانا نے فرمایا ——— "میں اب تک اس کو پسند نہیں کرتا تھا کہ اس تبلیغی کام کے سلسلے میں کچھ زیادہ لکھا پڑھا جائے اور تحریر کے ذریعہ اس کی دعوت دی جائے۔ بلکہ میں اس کو منع کرتا رہا۔ لیکن اب میں کہتا ہوں کہ لکھا جائے اور تم بھی خوب لکھو۔ مگر یہاں کے فلاں فلاں کام کرنے والوں کو میری یہ بات پہونچا کر ان کی رائے بھی لے لو۔" چنانچہ ان نامزد حضرات کو مولانا کی بات پہونچا کر مشورہ طلب کیا گیا۔ ان صاحبان نے اپنی رائے یہ ظاہر کی کہ اس بارے میں اب تک جو طرز عمل رہا ہے، وہی اب بھی رہے۔ ہمارے نزدیک یہی بہتر ہے۔

اس کے بعد مولانا کو یہ بات پہونچائی گئی۔ مولانا نے دوبارہ فرمایا ——— "ہم پہلے بالکل کس مپرسی کی حالت میں تھے۔ کوئی ہماری بات سنتا نہیں تھا۔ اور کسی کی سمجھ میں ہماری بات آتی نہیں تھی۔ اس وقت یہی ضروری تھا کہ ہم خود ہی چل پھر لوگوں میں پہلے طلب پیدا کریں۔ اور عمل سے اپنی بات سمجھائیں اس وقت اگر تحریر کے ذریعے عام دعوت دی جاتی تو لوگ کچھ کا کچھ سمجھتے۔ اور اپنے سمجھنے کے مطابق ہی رائے قائم کرتے اور اگر بات کچھ دل کو لگتی تو اپنی سمجھ کے مطابق کچھ سیدھی کچھ الٹی اس کی عملی تشکیل کرتے اور پھر جب نتائج غلط نکلتے تو ہماری اسکیم کو ناقص کہتے۔ اس لیے ہم یہ بہتر نہیں سمجھتے تھے کہ لوگوں کے پاس تحریر کے ذریعہ ہماری دعوت پہونچے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی مدد سے اب حالات بدل چکے ہیں۔ ہماری بہت سی جماعتیں ملک کے اطراف میں نکل کر کام کا طریقہ دکھلا چکی ہیں۔ اور اب لوگ ہمارے کام کے طالب بن کر خود ہمارے پاس آتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو اتنے آدمی دے دیئے ہیں کہ اگر مختلف اطراف میں طلب پیدا ہو اور کام سکھانے کے لیے جماعتوں کی ضرورت ہو تو جماعتیں بھیجی جا سکتی ہیں۔ تو اب ان حالات میں بھی کس مپرسی والے ابتدائی زمانہ ہی کے طریقۂ کار کے ہر ہر جز پر جمے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ تحریر کے ذریعے بھی دعوت دینی چاہیئے۔"

بعض مواقع پر مولانا نے اس کا بھی اظہار فرمایا کہ اس وقت جس قسم کے کارکن ہمارے گرد جمع ہیں

اس کے مطابق کام ہو رہا ہے ، اور دوسری دوسری صلاحیتوں والے لوگ آئیں تو کام میں مزید اضافہ ہو۔

قلم کے ذریعہ کے بارے میں مولانا کے جو خیالات تھے ، ان کو غالباً حسب ذیل طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ کوئی تحریک جب نئی نئی شروع ہوتی ہے تو ایک اہم مسئلہ اس کے صحیح تعارف کا ہوتا ہے اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ داعی کی زبان بذات خود زیادہ سے زیادہ تعارف کا ذریعہ بنے۔ مگر ایک وقت آتا ہے جب دعوت ساری فضا میں گونج اٹھتی ہے اور اس کی صدا سے سارا ماحول آشنا ہو جاتا ہے۔ اس وقت غلط تعارف کا اندیشہ بہت کم ہو جاتا ہے۔ کچھ الفاظ اصطلاح عام بن کر لوگوں کے ذہنوں میں جگہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس وقت مقرر یا محرر کے الفاظ ہی دعوت کے تعارف کا کام نہیں کرتے بلکہ ان کے ساتھ سننے والے کا اپنا وہ ذہن بھی شامل ہو جاتا ہے جو پہلے سے اس دعوت کے بارے میں ایک تعارف سے آشنا ہو چکا ہے۔ جب کوئی تحریک اس دوسرے مرحلہ پر پہونچ جائے تو ان ابتدائی تحفظات کی ضرورت نہیں رہتی جو دعوت کے آغاز میں ضروری سمجھے گئے تھے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر تحریک کے لیے کام کرنے کے سیکڑوں پہلو ہوتے ہیں۔ مگر عملی طور پر تحریک انھیں کاموں میں حصہ لیتی ہے جس کے لیے اس کے پاس کارکن موجود ہوں۔ ایسا کام جس کے لیے کارکن ہی حاصل نہ ہوں اس کو چھیڑنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ مولانا الیاس صاحب کا کام ابتداءً جس نقشہ کے مطابق چلا ، ایک لحاظ سے اگرچہ اس کی اہمیت یہ تھی کہ وہ بنیادی اور اصلی کام تھا ، مگر اس کے ظاہری ڈھانچہ میں اس واقعہ کا بھی دخل تھا کہ اس وقت جس نوعیت کے کارکن فراہم ہوئے وہ اسی ڈھنگ سے کام کو چلا سکتے تھے۔ اب اگر تحریک کو پھیلاؤ حاصل ہو جائے تو کام میں بھی اسی نسبت سے پھیلاؤ ہو جائے گا جیسا کہ کارکنوں کی اقسام میں پھیلاؤ ہوا ہے۔

۳۔ مولانا نے ایک مرتبہ بہت قیمتی بات فرمائی ــــ آپ نے فرمایا کہ ایک طریقہ دین کی عمومی تعلیم و تربیت کا ہے۔ اور دوسرا طریقہ وہ ہے جو "ضرورت حادثہ" کے تحت پیدا ہوتا ہے۔ پہلا جو طریقہ ہے وہی دور نبوت میں ملتا ہے اور عمومی تعلیم و تربیت اسی طریقہ پر ہونی چاہیے۔ دوسرا طریقہ حالات و ماحول کی رعایت سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں پہلے طریقہ میں دوامی قدر ہے اور دوسرے طریقہ میں زمانی قدر۔

مولانا کے اسی ملفوظ کی روشنی میں ہم تصنیف و اشاعت کے کام کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر

کو سمجھ سکتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں تصنیف و تالیف کی بے حد اہمیت ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج علمی سطح پر جو مسائل چھڑے ہوئے ہیں ان کو صحیح طور پر کتابی شکل ہی میں ایک دوسرے کے سامنے لایا جا سکتا ہے۔ دور عباسیہ میں یونانی علوم کی اشاعت سے اسلام کے لیے بہت سے ذہنی مسائل پیدا ہوئے جن کے جواب کے لیے علم کلام ایجاد ہوا اور علماء نے قلم کے ذریعہ ان کا جواب دیا۔ اسی طرح دور جدید میں افکار و خیالات کا ایک نیا سیلاب امنڈ آیا ہے جو مختلف پہلوؤں سے اسلام کو چیلنج کر رہا ہے۔ ہمیں اسلام کی طرف سے اس کا جواب فراہم کرنا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فکر اس کام کی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کرتا ہے۔ البتہ ان کے الفاظ میں اس کام کو ضرورتِ حادثہ کے تحت پیدا شدہ کام سمجھنا چاہیے نہ کہ اس کو اصلی اور عمومی کام سمجھ لیا جائے۔

اسی طرح ضرورت حادثہ کی اور بہت سی اقسام ہو سکتی ہیں مگر سب کا استقصار یہاں مقصود نہیں۔ (۱۳۸۶ھ)

اعلان

اوپر کا مضمون ان چند مضامین میں سے ایک ہے جو ۱۵۔ ۲۰ سال پہلے لکھے گئے تھے۔ ان مضامین کا مجموعہ ایک کتاب کی صورت میں زیر طبع ہے جو انشاء اللہ جلد ہی "تبلیغی تحریک" کے نام سے شائع کیا جائے گا۔

ادارۂ الرسالہ

خبر نامہ اسلامی مرکز۔ ۷

۱۔ کیسٹ میگزین کی بابت اس سے پہلے اعلان کیا جا چکا ہے۔ اس سلسلہ کا نام " الرسالہ کیسٹ " ہوگا۔ انشاء اللہ یکم مئی ۱۹۸۵ سے اس کی روانگی شروع ہوگی۔ اس کے بعد ہر انگریزی مہینہ کی پہلی تاریخ کو اس کی روانگی ہوتی رہے گی۔ یہ ماہانہ کیسٹ صدر اسلامی مرکز کی تقریروں پر مشتمل ہوگا۔ ہر کیسٹ میں موصوف کی دو تقریریں ۳۰۔۳۰ منٹ کی ہوں گی۔

۲۔ ۲۶ جنوری ۱۹۸۵ کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔ حسب معمول مرکز میں ماہانہ اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۸۲ پر درس دیتے ہوئے بتایا کہ یہ آیت اس بات کا زبردست ثبوت ہے کہ قرآن خدا کی طرف سے آئی ہوئی کتاب ہے۔ اس سلسلہ میں موصوف نے بہت سی علمی اور سائنسی دلیلیں پیش کیں۔ اس درس کا ٹیپ مرکز میں محفوظ ہے۔

۳۔ یکم فروری ۱۹۸۵ کو میر واعظ مولانا محمد فاروق کشمیری اسلامی مرکز میں آئے۔ صدر اسلامی مرکز سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ماہنامہ الرسالہ میں پابندی سے پڑھتا ہوں۔ انھوں نے مرکز کی تمام مطبوعات کا ایک سٹ فرمائش کر کے حاصل کیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی تحریروں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تخلیقی ہوتی ہیں۔ جب کہ عام طور پر اسلام پر لکھنے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ نقل اور روایتی تکرار سے زیادہ کوئی چیز نہیں پیش کر پاتے۔ مرکز کے مختلف شعبوں کا معائنہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہاں ہر کام جدید معیار کے مطابق کیا جا رہا ہے۔

۴۔ ۸ فروری ۱۹۸۵ کو پروفیسر آگوانی (ریکٹر جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی) مرکز میں آئے اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک صدر اسلامی مرکز سے تبادلہ خیال کیا۔ انھوں نے الرسالہ باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ ان کی فرمائش پر اسلامی مرکز کی مطبوعات انھیں پیش کی گئیں۔

۵۔ جو نئی کتابیں اس وقت زیر طبع ہیں ان میں سے ایک " سوشلزم اور اسلام " ہے۔ یہ کتاب ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے چار حصے ہیں۔ اس میں سوشلزم کا فکری و عملی جائزہ اور اسلام اور سوشلزم کا تقابل ہے۔ نیز معاشی مسئلہ کا فطری اور اسلامی حل بیان کیا گیا ہے۔ دوسری زیر طبع کتاب " اسلامی زندگی " ہے۔ یہ سیرت اور احادیث اور آثار پر مشتمل ہے اور عمومی سطح پر اشاعت دین کے لئے تیار کی گئی ہے۔

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

April 1985
Number 101

AL-RISALA MONTHLY
C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128